آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi
نومبر 2019
www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

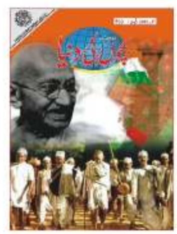

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

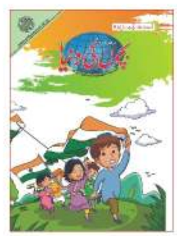
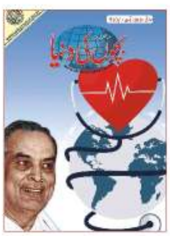

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

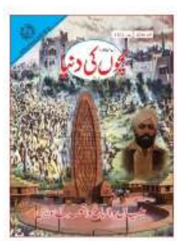
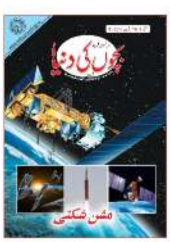

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	مساوات مرد وزن کے عظیم علمبردار گرونانک دیو جی	خواجہ عبدالمنتقم	5
روبرو	شبنم عشائی سے انٹرویو	حقانی القاسمی	8
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		11
جہان نسواں	سول نافرمانی کی تحریک میں خواتین کا رول	ڈاکٹر کامنی ورما	12
	فریاد داغ اور داغ دہلوی	ڈاکٹر مسرت جہاں	14
	مہ لقا چندا: دکن کی اولین نسائی آواز	ڈاکٹر شیخ ریحانہ بیگم	18
	شہزادیٔ دکن: ملکہ حیات بخشی	ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ	24
	نومبر میرا گہوارہ	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	27
	'دلیلِ سحر' کے خطوط کی تانیثی قرات	ڈاکٹر مسرت	32
	بچوں کی تعلیمی نشوونما اور والدین کی ذمہ داریاں	ڈاکٹر محمد طالب اطہر انصاری	37
کہانیاں	اماں بی	نصرت شمسی	43
	نیکی رنگ لاتی ہے	زینت جبین صدیقی	45
	ذرا اعتبار پالے	ڈاکٹر عشرت ناہید	49
حسن سخن	شمشاد بیگم سنبل، فوزیہ رباب		53
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	آیوڈن: ضرورت اور افادیت	عظیم اقبال	56
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			62

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:3 شمارہ: 11 نومبر 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

زبان اور ادب نے قوم کی اصلاح اور ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ادب اور تعلیم کے ذریعے قوم کی اصلاح ہوتی ہے۔ ادب معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب کے ذریعے نہ صرف معاشرے میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے بلکہ اہم مسائل پر گفتگو بھی کی جاسکتی ہے اور کسی بھی پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بیک وقت مفکر، ادیب اور فلسفی تھے۔ وہ ایک بہترین صحافی اور تحریک آزادی کے علمبردار بھی تھے۔ ان کا اہم کارنامہ 'الہلال' اور 'البلاغ' کی اشاعت ہے۔ محض 14 برس کی عمر میں ہی انھوں نے صحافت کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اس عہد کے نہایت معیاری جرائد ورسائل کے لیے گراں قدر مضامین لکھے البتہ الہلال اور البلاغ میں ان کا منفرد اسلوب سامنے آیا۔ مولانا آزاد کی نگاہ دور رس تھی۔ ان کے حافظے کی قوت اور ان کی بصیرت وبصارت ان کی شخصیت کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرد اور عورت دونوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک ہماری قوم خصوصاً خواتین پڑھی لکھی نہیں ہوں گی، قوم ترقی نہیں کر سکے گی۔ خواتین سے نہ صرف گھر کی آبیاری ہوتی ہے بلکہ وہ بچوں کے لیے پہلے مدرسے کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ خواتین اگر پڑھی لکھی ہوں گی تو وہ کئی نسلوں تک اپنا علم منتقل کر سکیں گی اور بہتر انداز سے ان کی تربیت کر سکیں گی۔

ابوالکلام آزاد نے دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تعلیم پر بھی زور دیا۔ تعلیمی شعبوں میں انھوں نے مرد اور خواتین دونوں کو یکساں مواقع فراہم کیے۔ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے انھوں نے اعلیٰ اقدامات کیے۔ انھوں نے بحیثیت وزیر تعلیم کے میدان میں کئی نمایاں کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے کئی پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کی بنیادی ڈالی۔ وزیر تعلیم ہونے کے ناطے انھوں نے ایسے بہت سے بنیادی کام کیے جو صرف انھیں سے منسوب قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے تعلیم کے لیے کچھ نئی تجاویز کو بھی منظوری دی۔ انھوں نے تعلیم اور ثقافت کی طرف خصوصی توجہ دی اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے دور وزارت میں کئی یونیورسٹیوں کی تشکیل کی گئی اور کچھ اہم اداروں کا قیام ہوا جن میں آئی آئی ایم اور آئی آئی ٹی (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی) کو اہم مقام حاصل ہے۔ سائنسی، تحقیقی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت سے منصوبے بنائے گئے اور ان منصوبوں پر عمل بھی ہوا۔ موجودہ ہندوستان میں سب سے زیادہ اعزازی مانے جانے والے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ آئی آئی ٹی اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینیجمنٹ کی تشکیل بھی مولانا آزاد کے ذریعے ہی ہوئی۔ علاوہ ازیں یو جی سی کی تشکیل میں بھی انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ فنون لطیفہ اور ادبیات کے لیے انھوں نے اکادمیوں کی بنیاد ڈالی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ صرف تعلیم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے بلکہ آزادی کی لڑائی میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے رولٹ ایکٹ 1919 کی گاندھی جی کے ساتھ مل کر مخالفت کی تھی اور عدم تعاون کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بھی اپنا تعاون پیش کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے مسلم قائد تھے جنھوں نے مذہب سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ ان کا ماننا تھا کہ آزاد ہندوستان کا ہر شہری مساوی حقوق رکھتا ہے۔ انھوں نے مذہبی منافرت کو بھی ختم کرنے کی بات کی۔ مولانا کا تصور قومیت بیک وقت وطن دوستی اور انسان دوستی سے مرکب ہے۔ عملی طور پر وہ تمام فرقوں اور طبقوں کو متحد کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی، اصلاح اور ترقی پر بہت زور دیتے تھے۔

پورے ملک میں مولانا آزاد کا یوم پیدائش 11 نومبر کو اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری دفاتر میں یوم تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس سال اس دن کو حکومت ہند نے خصوصی طور پر منانے کی اپیل کی ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

خواجہ عبدالمنتقم

مساوات مرد وزن کے عظیم علمبردار

گرونانک دیوجی

سکھ مذہب کے بانی گرونانک دیوجی، جن کی پیدائش کی 550ویں سالگرہ کے موقع پر پوری قوم انھیں خراج عقیدت پیش کر رہی ہے اور گرودوارہ دربار صاحب جانے کے لیے کرتارپور کوریڈور بھی کھولا جا رہا ہے، عورتوں کے حقوق کے عظیم علمبردار تھے۔ انھوں نے عورتوں کو نہ صرف برابر مانا بلکہ گربانی میں یہ کہہ کر ان کے مرتبہ کو اور بھی زیادہ بلندی عطا کی کہ یہ عورت ہی ہے، جس نے پیغمبروں، اوتاروں، مہاپرشوں، سورماؤں وغیرہ کو جنم دیا۔ دریں صورت عورت ذات کے ساتھ انصاف نہ کرنا اس کی تذلیل کرنا یا اسے کمتر سمجھنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ نہ صرف گرونانک نے بلکہ دیگر گروصاحبان نے بھی کبھی بھی ذات پات، رنگ بھید، نسلی امتیاز، کسی جنس کی بالادستی وغیرہ کی بات نہیں کی بلکہ انھوں نے ہمیشہ مساوات کی بات کی۔ اگر ہر سکھ کے نام کے آخر میں لفظ سنگھ (یعنی شیر) کا استعمال کیا گیا تو ہر سکھ عورت کے نام کے آخر میں کور (یعنی شہزادی) لفظ کا استعمال کر کے اسے پوری عزت دی گئی۔

گرونانک سمیت تمام گروصاحبان نے مذہبی و دنیاوی معاملات میں عورتوں کو عزت دی اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ انھیں سماجی و سیاسی میدان میں وہی حقوق اور مراعات حاصل رہیں جو مردوں کو حاصل تھیں۔ یہ ان سکھ گروؤں کی ہی دین ہے کہ آج ایک سکھ عورت گرنتھی اور مبلغ دونوں کا ہی کردار نبھانے کی اہل ہے، نبھا رہی ہے اور نبھاتی رہی ہے۔ وہ گربانی کا پاٹھ بھی کر سکتی ہے، گرودوارہ میں سیوا بھی کر سکتی ہے اور اس طرح کے نیک کاموں میں رہنما کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔ وہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں، خواہ ان کا تعلق انتظام وانصرام ہو یا تعلیمی امور سے، ایک فعال رول ادا کر سکتی ہے اور کر بھی رہی ہے۔ گروگوبند سنگھ جی کی اہلیہ ماتا صاحب کور نے اس امرت کی تیاری میں پورا پورا حصہ لیا جو پنج پیاروں کو گروگوبند سنگھ جی کے ذریعہ خالصہ کی تشکیل کے وقت چکھایا گیا تھا۔

سکھ گروصاحبان نے عورت کو محض جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت ایک ماں بھی ہے اور کون ایسا شخص ہوگا کہ جو اپنی ماں کی عزت نہ کرے۔ گربانی کا مندرجہ ذیل اقتباس اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے۔

یہ عورت ہی ہے۔ جس نے ہمیں جنم دیا ہے۔
رحم مادر میں ہی ہم نے جسمانی شکل اختیار کی۔
ہمارا عورت سے اٹوٹ رشتہ ہے۔
عورت ہی ہماری بیوی بنتی ہے۔
عورت ہی ہماری دوست ہے۔
عورت سے ہی خاندان وجود میں آتا ہے۔

اگر عورت مرجاتی ہے، تو ہم دوسری عورت کے خواہاں ہوتے ہیں۔

عورتیں ہی دنیا میں باہمی روابط وتعلقات کا ذریعہ ہیں۔

عورتوں کو، جنھوں نے بادشاہوں تک کو جنم دیا، برا کہنے کا کوئی جواز نہیں۔

عورت سے عورت ہے یعنی عورت ہی سب کچھ ہے۔

عورت کے بغیر کچھ نہیں۔

نانک، عورت کے بغیر بس

تنہا ایک رب ہی ہے (اے جی، صفحہ 473)12

بی بی نانکی، ماتا کھیوی، ماتا گجری، ماتا صاحب کور، مائی بھاگو، مائی سدا کور، مہارانی جند کور اور مہارانی صاحب کور جیسی عظیم سکھ خواتین کی ان خدمات کو کون نظر انداز کرسکتا ہے جنھوں نے سیاسی وسماجی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فوجی حکمت عملی اور فن حرب کے معاملے میں بھی انھوں نے ضرورت پڑنے پر فعال کردار ادا کیا۔ اب سے لگ بھگ 5 صدی قبل گرونانک جی نے صنفی امتیاز کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ وہ دور تھا جب یوروپ اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی عورتوں کو نہ تو برابر کے حقوق میسر تھے اور نہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ یونانی تہذیب میں، جس کا شمار علمی وتمدنی اعتبار سے دنیا کی بہترین تہذیبوں میں ہوتا تھا یہ صنف نازک زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے مقابلے میں پچھڑی ہوئی تھی اور قانونی، معاشی، سیاسی، ومعاشرتی حقوق کی تو بات ہی کیا بلکہ بہت سی دیگر آزادیوں سے بھی محروم تھی۔ انگلستان، جسے انسانی حقوق اور خاص کر خواتین کے حقوق کا دیگر مغربی ممالک کی طرح ایک معتبر علمبردار سمجھا جاتا ہے، وہاں بھی عہد قدیم میں عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی، یہاں تک کہ لاغر اور بدشکل لڑکیوں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ ان کی قسمت میں صرف اپنے شوہر، سرپرست اور پادری کی غلامی کرنا تھا۔

سکھ گرو صاحبان ہمیشہ سماجی برائیوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ گرو امر داس جی نے ستی کے خلاف ان الفاظ میں آواز اٹھائی:

ستی وہ نہیں، جو اپنے شوہر کی چتا پر اپنے آپ کو سپرد آتش کر رہی ہے۔

نانک: ستی وہ ہے، جس کی جدائی کے صدمے سے موت واقع ہوجائے۔

ہاں، ستی وہ ہے جو خود کو زندہ رکھتی ہے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتی ہے۔

اس کے ساتھ اپنے رب کو ہر صبح یاد کرتی ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرتی ہے۔

***

عورتیں اپنے شوہر کی چتا پر جل کر جان دے دیتی ہیں۔

لیکن اگر وہ اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی ہیں

تو انھیں جدائی کے اس درد کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔

انھوں نے مزید کہا:

اگر عورت اپنے شوہر سے محبت نہیں کرتی تو پھر وہ خود کو سپرد آتش کیوں کر رہی ہے؟

وہ (اس کا شوہر) زندہ ہو یا مردہ اس کے لیے بے معنی ہے

کیونکہ اب وہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ (اے جی، صفحہ 787)۔13

چھٹے گرو گرو ہرگوبند جی نے عورت کو آدمی کا ضمیر، حسن اخلاق وحسن عمل کی نشانی اور بہترین شریک حیات بتایا۔ سکھ مذہب نے شیرخوار بچیوں کو قتل کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی اور انھیں اچھی تعلیم دلانے کی وکالت کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج سکھ خواتین کی شرح خواندگی دیگر مذاہب کی خواتین کے مقابلے میں بہتر ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق سکھ خواتین کی شرح خواندگی 80.3 فیصد ہے جب کہ ہندو خواتین کی شرح خواندگی 65.1 فیصد ہے اور مسلم خواتین کی شرح خواندگی 59.1 فیصد ہے۔

تیسرے گرو، گرو امر داس نے کافی عورتوں کو مشنری کے طور پر کام کرنے کی تربیت دی اور انھیں یہ ذمہ داری بھی سونپی۔ سکھ خواتین نے

جہاں گرنتھیوں کا کردار نبھایا وہیں میدان جنگ میں بھی پیچھے نہیں رہیں۔ وہ جنگ آزادی کے دوران اور انسانی حقوق کے تحفظ کی مہم میں ہمیشہ مردوں کے شانہ بہ شانہ رہیں۔ سکھ مذہب میں بیواؤں کو پوری عزت دی جاتی ہے اوران کا دوبارہ شادی کرنا برا نہیں سمجھا جاتا۔

جہاں تک سکھ خواتین کے کارہائے نمایاں کی بات ہے تو گرونانک کی بہن نانکی اوران کی والدہ نے گرونانک کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے گروجی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ماتا کھیوی نے لنگر کی ذمہ داری سنبھال کر خواتین میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا۔ گروتیغ بہادر کی شہادت کے بعد ماتا گجری نے اپنے بیٹے گروگوبند سنگھ کی بہترین تربیت کی اور گروگوبند کے چاروں صاحبزادوں کو تربیت دی اور ان کی رہنمائی کی۔ ماتا سندری نے گروگوبند کے انتقال کے بعد بڑے مشکل وقت میں سکھوں کی رہنمائی کی۔ مائی بھاگو نے مکتسر کی لڑائی میں چالیس مردوں پر مشتمل بٹالین کی بطور قائد رہنمائی کی اور سب کے ساتھ جام شہادت پی کر اپنی قائدانہ صلاحیت کا لوہا منوایا۔ اس کے بعد بھی سکھ خواتین ہر دور میں اپنے اپنے میدان میں سرگرم عمل رہیں۔ ان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خوش دامن سردارنی سدا کور، سردارنی شرن گت کور اور ماتا کشن کور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آج بھی سکھ خواتین ہر میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔

متذکرہ بالا حقائق اس بات کا معتبر ثبوت ہیں کہ سکھ مذہب میں خواتین کو ہر میدان میں برابر کی حصہ داری اور حقوق حاصل ہیں اور حاصل رہے ہیں۔

□□□

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartments
2-I.P. Extension
Delhi-110092

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

عورت تو خود ایک کچلا ہوا خواب ہے

شبنم عشائی

حقانی القاسمی

عورت کے من میں برف جم جائے تو اسے پگھلنے میں بہت دیر لگتی ہے۔ عورت اگر حد سے زیادہ حساس ہو تو پگھلنے کی مدت بڑھ بھی سکتی ہے۔

وادیٔ کشمیر کے تاریخی ترپٹن سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر شبنم عشائی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہایت حساس خاتون ہیں۔ وہ نہ انفعالی ہیں اور نہ ہی Ineffectual۔ ان کے وجود میں اتنی اضطراب آمیز لہریں ہیں کہ کسی ایک لہر کو گرفت میں لینا آسان نہیں۔ وہ جتنی وارفتگی سے شبنمی لے میں بہتی رہتی ہیں، اتنی ہی شدت سے شعلگی کا لباس بھی پہن لیتی ہیں۔ ان کی سرکشی میں تابع داری اور اطاعت میں بغاوت کا گماں گزرتا ہے۔ وہ خوشبوئیں خرچ کر کے درد خریدنا جانتی بھی ہیں اور اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے طلاق دینے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ انھیں رفاقتوں کی آنچ میں پگھلنا بھی آتا ہے اور لاتعلقی کے پانی میں تیرنا بھی۔

من کی دنیا میں گھر بنانے کی آرزومند شبنم عشائی اپنے خوابوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر زندگی بسر تو کر رہی ہیں مگر ان کی آنکھوں میں نہ تو کاجل ہے نہ سپنا، شاید ان کے خواب مصلوب کر دیے گئے ہیں۔ اب ان کی آنکھوں میں صرف خوف اور اندیشے ہیں یا وہ اپنے سپنے ٹرالیز میں لیے خلاؤں میں گھوم رہی ہیں۔

ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود شبنم عشائی کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے اور ہندوستان میں ان کی طرح ہزاروں ملازمت پیشہ خواتین کا دکھ یہ ہے کہ وہ اکیلے پن کی اذیتیں سہتی ہیں اور اپنے حصے کے ساون سے بھی محروم رہ جاتی ہیں۔

اکیلی (1999)، میں سوچتی ہوں (2000)، من بانی (2002)، کتھارسس (2008)، من میں جمی برف (2013) جیسے مجموعوں کے ذریعے دنیا سے اپنے من کی بات بانٹنے والی شبنم کے دل میں

بہت سی باتیں ایسی ضرور ہوں گی جو شاید Defamation کے ڈر سے کہہ نہ پائی ہوں یا سب کچھ کہنے کے باوجود بھی کہنے کے لیے، بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ یوں بھی خواتین اپنے Dark & Deep سکریٹس کو کسی سے شیئر نہیں کرتیں۔ وہ بہت سی سچائیوں کو اپنے سینے میں دفن کر لیتی ہیں۔ خاموش رہ جاتی ہیں اور یہی خاموشی عورت کی اذیت بن جاتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شعبہ فلسفہ سے وجودیت پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی اور انگریزی میں Alienation جیسی کتاب کی مصنفہ کے من میں اترنے کی کوشش کی تو مجھے لگا کہ عورت کے من کی تھاہ پانا خردمند مردوں کے لیے بھی مشکل ہے، خاص طور پر ایسی عورت کی جو اپنے جسم پر ٹیلکم نہیں اپنے وجود پر نمک چھڑکنے کی عادی ہو اور جس کے من کی مٹی میں موت بودی گئی ہو۔

معاصر نظمیہ افق پر جو چند high-end شاعرات ہیں، ان میں ایک نام شبنم عشائی کا بھی ہے مگر یہاں ان سے ادب پر نہیں بلکہ خواتین، سماج اور سیاست کے مسائل و متعلقات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے کیونکہ آج کا فن کار زندگی کی نامیاتی حقیقتوں اور جدلیاتی حرکتوں سے اپنا رشتہ توڑتا جا رہا ہے، وہ اپنی ذات کے خول میں اس طرح بند ہو گیا ہے کہ باہر کی واردات اور وقوعات سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں رہ گیا ہے اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا صرف میر و غالب پر گفتگو سے جدید معاشرے کے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

پیش ہیں شبنم عشائی سے **حقانی القاسمی** کی گفتگو کے کچھ اقتباسات:

کیا فیمنزم نے آزادی کے نام پر عورتوں کو عریاں کیا ہے؟

شبنم: میری لکنت
اس قلم کی زبان ہے جس کو
تمہاری انا نے تراشا
اور یہ جو گونج ہے
میرے وجود کے
ٹوٹنے کی آواز ہے
کوئی فیمنزم نہیں
بے حیثیتی ہے

مرد کی انا نے عورت کے ان چاہے وجود کو جس انجان سڑک پر پھینکا ہے، وہی اس کی منزل ہے۔ آدم کی پسلی سے نکلی ہوئی حوا کو اس جہان فانی میں سرگرداں خاک بسر پھرتے یہ گیان ہے کہ مرد کے ہاتھوں سے وہ صحیفے کھو گئے ہیں، جن میں امن، انصاف، عقل و فہم، مروت و ہمدردی کی عبارتیں درج تھیں۔ اس لیے وہ اپنے کھوئے ہوئے صحیفوں کو یاد دلا کر اس مادری نظام کو روشن کرنا چاہتی ہے جسے نسائی احتجاج کا نام دے دیا گیا ہے۔

آج کی عورت اتنی مزاحمت پسند کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

شبنم: باشعور خواتین مرد اساس معاشرے کے خلاف مزاحمتی ردعمل ظاہر کرتی رہی ہیں کیونکہ انھیں احساس ہے کہ عورت محض جنسی معروض نہیں ہے بلکہ اس کا زندہ اور توانا وجود ہے۔ وہ یہ احساس دلانا چاہتی ہیں

کہ انھیں اپنی ترجیحات کے تعین کا پورا حق حاصل ہے۔

کیا عورتوں کے امپاورمینٹ کی آڑ میں مردوں کو مفلوج بنایا جارہا ہے؟

شبنم: میں سمجھتی ہوں کہ دونوں ہی مفلوج ہو رہے ہیں۔ عورت تمدن کی جڑ ہے، وہ ماں ہے، وہ بیٹی ہے، بہن ہے، بیوی ہے۔ عورت کے وجود سے ہی زندگی میں حسن ہے اور اس کے سوز وساز سے ہی گھر آباد ہے۔ امپاورمنٹ کی آڑ میں یہ جڑ کہیں اکھڑ نہ جائے۔ اس جڑ کو سینچتے رہیے۔

کیا فیمنزم کی وجہ سے عورت مرد سے دور ہوتی جارہی ہے؟

شبنم: ایسا نہیں ہے۔ مرد کی خودمختاری کے غلط استعمال سے عورت مرد کے مابین رشتے کے استحکام اور اعتبار پر منفی اثرات پڑے۔ عورت اپنے اندر سفر کرنے لگی کیونکہ بیرونی زندگی کے معنی اور مطلب اور رشتوں کی بے لذتی اس پر آشکار ہوئی۔

تم محبت سے میرا من گوندھتے
میں روشنائی سے
اپنی تنہائی نہ گوندھتی
تنہائی گوندھتے گوندھتے
میں روٹی پکانا
بھول گئی ہوں
کیا عورت ایسی ہوتی ہے؟
حیرت کے دکھ کو
کیسے سہلاؤں؟
من کے تسمے کستی ہوں
سفر میرا خواب نہیں
گھر کا دروازہ بند پڑا ہے

کیا گلوبلائزیشن کے عہد کی عورت مرد کے مساوی ہے اور کیا وہ ایکول ہو کر self-sufficient بھی ہے؟

شبنم: عورت مرد کے برابر کیوں ہو بھائی۔ جب اس کی پیدائش ہی مختلف ہے۔ جنت میں آدم کے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ بغیر آدم کے عورت self-sufficient کیسے ہوسکتی ہے؟

مرد عورت کے درمیان bone of contention (تنازع کی جڑ) کیا ہے؟

شبنم: Awareness، آگہی۔ عورت جان چکی ہے کہ وہ انسان کہلانے کی مستحق ہے۔ وہ سوچی ہوئی سوچ کو جی نہیں سکتی۔ اس کے اندر بھی انا پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا بھی ایک مزاج اور موڈ ہے۔

نہ جانے کیا خریدنے
گھر سے چلی تھی
کہیں کچھ بھی ایسا
بازار میں نہیں
جو دامن گیر ہوتا
اب
خالی ہاتھ
تماشائی بنی
بازار سے گزر جاؤں گی

کوئی خواہش کوئی خواب جس کے پورا نہ ہونے کا ملال ہو؟

شبنم: عورت کا خواب اس کا گھر ہوتا ہے۔ جہاں وہ پہلے اپنے میاں کا خواب سجاتی ہے پھر اولاد کے خواب پرونے لگتی ہے۔ عورت کے خواب ہی کہاں ہوتے ہیں؟ وہ اپنی ذات کے لیے جیتی ہی کب ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہے جب عورت صرف اور صرف اپنی ذات کے لیے جئے۔ اگر وہ خواب دیکھ لے تو نافرمان کہلاتی ہے اور نافرمان کہلانا کوئی بھی عورت afford نہیں کرسکتی۔ عورت تو بذات خود کچلا ہوا خواب ہے۔ وہ عذاب کی زندگی جی رہی ہے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی عورت پر، جو دن بھر مزدوری کرتی ہے، مارکیٹنگ کرتی ہے اور پھر خود ہی پکاتی اور خود ہی کھاتی ہے۔ میں خود بھی زندگی چلانے کے لیے کبھی مرد بن جاتی ہوں کبھی عورت۔ میرے تلوے ترستے ہیں کہ میں صحن کو چھولوں مگر میں ایسا کر نہیں پاتی۔

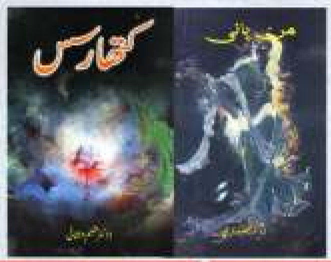

عورت کا خواب اس کا گھر ہوتا ہے۔ جہاں وہ پہلے اپنے میاں کا خواب سجاتی ہے پھر اولاد کے خواب پرونے لگتی ہے۔ عورت کے خواب ہی کہاں ہوتے ہیں؟ وہ اپنی ذات کے لیے جیتی ہی کب ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہے جب عورت صرف اور صرف اپنی ذات کے لیے جئے

کیا عورت مرد نے رشتوں کی نزاکتوں کو سمجھنا چھوڑ دیا ہے؟

شبنم: ان کے پاس وقت ہی کہاں ہے کہ وہ رشتے کی نزاکتوں کو سمجھیں۔ مادیت حاوی ہوگئی ہے۔ صرف ایک ہی ویلیو باقی ہے اور وہ ہے پیسہ۔

کیا مرد کے بغیر تعلیم یافتہ نوکری پیشہ عورت محفوظ ہے؟

شبنم: نہ تعلیم نہ نوکری اور نہ مرد عورت کی عصمت کے محافظ ہیں۔ عورت ہی خود اپنی نسوانیت کی محافظ بن سکتی ہے۔ کیونکہ عورت جس معاشرے میں جیتی ہے وہاں مرد عورت کی عظمت کو نہیں سمجھتا۔ یا سمجھنے کے باوجود عورت کی عظمت کو نہیں مانتا ایسی صورت میں پھر عورت بھی عورت نہیں رہ پاتی۔ ☐☐☐

haqqanialqasmi@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

دلوں کے زخم چھپاؤ ہنسی کو عام کرو
یہ حکم ہے کہ بہاروں کا احترام کرو

سیاہیوں میں امیدیں نہ راہ کھو بیٹھیں
طلوعِ صبح یقیں ہے فکرِ شام کرو

زہرا نگاہ

یہ راہ سخت یہ دشتِ الم کی پہنائی
قدم قدم پہ ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی

امید و بیم کے صحرا میں یہ طویل سفر
تپش پہ سوزِ دروں کی یہ آبلہ پائی

زاہدہ زیدی

وہ نظر عکس تھا جس میں کئی دنیاؤں کا
ٹوٹے آئینے کا انبار نظر آتی ہے

رختِ دل، صحبتِ غم، معبدِ جاں خاک بسر
زندگی برسرِ پیکار نظر آتی ہے

ساجدہ زیدی

یہ کیوں کہوں کہ اسیری مرا مقدر ہے
وہی ہے قوتِ پرواز بال و پر میں ابھی

وہ راہ رو ہوں جو کرتے ہیں منزلیں تشکیل
میں وہ نہیں کہ جسے قافلے کی دھول ملے

رشیدہ عیاں

لٹتے رہے اسیرِ شبِ تار راہ میں
جلتے رہے چراغ مگر کارواں سے دور

تسلی دے رہا ہے ہم کو میرِ کارواں پیہم
غبارِ راہ ہے لیکن پریشاں دیکھیے کیا ہو

وحیدہ نسیم

ہم کو تلاش جادۂ ملکِ بقا کی ہے
وہ راہ جس میں پہلی ہی منزل فنا کی ہے

کہاں ہے تو یہ پتا دے حقیقتِ ازلی
ہمیں تو دیر و حرم میں ترا نشاں نہ ملا

سیدہ فرحت

وہ اک نگاہ جو اتری تھی حرف کی طرح
ہمارے دل میں سمائی تو کائنات ہوئی

غمِ حیات کی خوشبو سے کچھ مہک اٹھی
یہ زندگی کہ ہے اک دشتِ آرزو کی طرح

ممتاز مرزا

پھر گنبدِ عالم میں گونجے گی صدا میری
اس مہرِ خموشی کو گر توڑ دیا جائے

بہت قریب سے دیکھا ہے زندگی تجھ کو
ہزار رنگ بدلتی ہے آسماں کی طرح

جمیلہ بانو

ڈاکٹر کامنی ورما

سول نافرمانی کی تحریک میں خواتین کا رول

دسمبر 1929 میں، لاہور میں دریائے راوی کے کنارے منعقدہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مکمل سوراج قومی تحریک کا ہدف طے کیا گیا۔ 26 جنوری 1930 کو ملک بھر میں یوم آزادی بھی منایا گیا۔ مکمل آزادی کے حصول کے لیے نمک قانون توڑنے والی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ نمک ہوا، پانی کی طرح مفت دستیاب ہے، یہ سمندر کے کنارے، نمک کے پہاڑ اور مٹی سے پانی جمع کرکے بنایا جاسکتا ہے، حکومت نے صرف ٹیکس لینے کے لیے اس کے بنانے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ غریبوں کو مناسب مقدار میں نمک نہیں ملتا ہے، لہٰذا اس ٹیکس کو ختم کیا جانا چاہیے۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے سے پہلے برطانوی حکومت سے پوچھنا شروع کیا۔ 2 مارچ 1930 کو، اس نے وائسرائے کو خط لکھ کر سمجھوتہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی کوشش ناکام رہی۔ اس سے قبل، 30 جنوری 1930 کو اپنے خط میں، نوجوان ہندوستان کی طرف سے مکمل پابندی، سیاسی قیدیوں کی رہائی، فوجی اخراجات میں 50 فیصد کمی، سول سروس افسران کی تنخواہوں میں کمی، اسلحہ قانون میں اصلاحات، انٹیلیجنس سسٹم میں تبدیلی، روپے اسٹرلنگ کی نرخوں میں کمی، غیر ملکی ٹیکسٹائل کی درآمد پر پابندی، ہندوستانی ساحل صرف ہندوستانیوں کے لیے محفوظ، جیوپولیٹکس میں کمی اور نمک ٹیکس کے خاتمے جیسے گیارہ مطالبے وائسرائے اروِن Irvin کے سامنے رکھے۔ مذکورہ بالا سارے مطالبات مسترد کیے جانے کے بعد، 12 مارچ 1930 کو، گاندھی جی نے ودیاپیٹھ سمیت 76 ساتھیوں کے ساتھ، 6 اپریل کو سابرمتی آشرم سے 200 کلومیٹر دور داندی نامی مقام تک 24 دن کی پیدل یاترا کرکے ساحل پر نمک بنا کر برٹش قانون کی نافرمانی کی۔ قوم پرست خواتین کو اس پیدل یاترا میں کسی بھی خاتون کے شامل نہ کرنے کا بہت دکھ ہوا تھا۔ استری دھرم میگزین کی ایڈیٹر مارگریٹ کوزنز نے بھی اپنے رسالے میں اس کی مخالفت کی تھی۔ دادا بھائی نوروجی کی پوتی خورشید نے بھی گاندھی جی کو ایک ناراضگی بھرا خط لکھا۔ آخر کار، کملا دیوی چٹوپادھیائے کی اپیل پر، گاندھی جی اور کانگریس کمیٹی نے خواتین کو اس تحریک میں شامل کیا۔

اس تاریخی دورے کے آخری دن، سروجنی نائیڈو نے ان کے ساتھ شامل ہوکر گرفتاری دی۔ وہ اس کارروائی میں گرفتار ہونے والی پہلی خاتون تھیں۔ اس کے بعد، لاڈو رانی زتشی، کملا نہرو، ہنسا مہتا، ستیہ وتی، اونتکا بائی گوکھلے، پاروتی بائی، رکمنی دیوی، لکشمی پتی، لیلاوتی منشی، درگا بائی دیشمکھ نے پردا چھوڑ کر بڑی تعداد میں نمک ستیہ گرہ مہم میں حصہ لیا اور بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی دیں۔ انھوں نے اپنی الگ تنظیمیں تشکیل دیں۔ ناری ستیہ گریہ کمیٹی، دیش سیویکا سنگھ، مہیلا راشٹریہ سنگھ، استری سوراجیہ سنگھ، پکیٹنگ بورڈ جیسی تنظیموں کے ذریعہ نہ صرف ستیہ گرہ کیا بلکہ چرخہ چلانے کی تربیت دی، کھادی فروخت کرنے اور اس کو فروغ دینے کا کام بھی کیا۔

کملا دیوی چٹوپادھیائے کے الفاظ میں، عورتیں گھر کی دہلیز کو عبور

کرتے ہوئے، فوجیوں کی طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے سمندر میں کود پڑیں۔ انھوں نے ہتھیاروں کے بجائے کیچڑ، تانبے اور پیتل کی گگریاں اور وردی کے بجائے عام ہندوستانی دیہی ساڑیاں پہنی تھیں۔ ہزاروں نوجوان، بزرگ، امیر، غریب خواتین اپنے معاشرتی بندھن کو ترک کر کے بغیر کسی خوف کے سول نافرمانی تحریک میں شامل ہو گئیں۔ خواتین نمک کا پیکٹ اپنے ہاتھوں میں لے کر فخر سے سڑکوں پر آواز لگاتیں ہم نے نمک کا قانون توڑا ہے اور ہم آزاد ہیں۔ ہے کوئی جو اس آزادی کے نمک کو خریدنا چاہتا ہے۔'' آس پاس سے گذرنے والے لوگ نمک خرید کر اور پیسے دے کر فخر سے آگے بڑھ جاتے۔

پورے ملک میں نمک بنا کر قانون کی سراسر خلاف ورزی کی گئی، نمک بنانے کے بہت سے طریقے وضع کیے گئے۔ بمبئی، کلکتہ سمیت ملک کے کئی مقامات پر ہڑتالیں کی گئیں۔ جلوس نکالا گیا، جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔ اسمبلی اور کونسل کے ممبروں نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ دینے والوں میں متھولکشمی ریڈی اور ہنسا مہتا بھی شامل تھیں۔ نوجوانوں نے سرکاری کالج اور نوکریاں چھوڑ دیں اور بدیسی کپڑے جلا دیے۔ ستیہ گرہ کرنے والے تقریباً 2500 افراد نے دھرسانا کے نمک گودام پر قبضہ کیا۔ اس کے جواب میں، برطانوی حکومت نے وحشیانہ اور ظالمانہ کارروائی کی اور گاندھی جی سمیت 60,000 سے زیادہ خواتین و مردوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ حکومت کے جبر و تشدد کے غیر انسانی عمل پر نیو یارک ٹیلیگرام کے نمائندے باب طرنے کچھ یوں تبصرہ کیا تھا۔

''22 ممالک کے 18 اخبارات کی رپورٹنگ میں، میں نے بے شمار خانہ جنگی، فسادات، سڑکوں پر لڑائیاں اور بغاوت دیکھی ہے لیکن دھرسانا جیسا دل دہلا دینے والا منظر نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی یہ منظر اتنا تکلیف دہ تھا کہ مجھے آنکھیں بند کر لینی پڑیں۔ رضا کاروں کا نظم و ضبط حیرت انگیز تھا، پولیس کی ظالمانہ کارروائیوں کا رضا کاروں نے ایک بار بھی جواب نہیں دیا اور انگریز حکومت کا ظلم سہتے رہے۔''

دی رائز اینڈ فال آف ہٹلر کے مصنف ولیم ایل۔ شیرر نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے، یہ ایک افسوسناک منظر تھا، عدم تشدد کے شاندار نظم و ضبط پر میں حیرت زدہ تھا کہ گاندھی جی کے اصولوں نے انھیں سکھایا تھا، انھوں نے جوابی کارروائی نہیں کی، اپنے چہروں اور سروں کو لاٹھیوں کے وار سے بچانے کی کوشش کے سوا اپنا دفاع نہیں کیا۔

پولیس نے سروجنی نائیڈو کی سربراہی میں خواتین کی تنظیم پر بہیمانہ کارروائی کی۔ یکم اپریل، 1930 کو، سوروپ رانی نہرو کی زیر قیادت خواتین مظاہرین پر پولس نے لاٹھی چارج کیا، جس میں سوروپ رانی کے سر میں شدید چوٹ آنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئیں۔ دہلی میں خواتین کے جلوس پر بھی لاٹھی چارج کیا گیا جس میں دس خواتین بری طرح زخمی ہو گئیں، بلساڑ میں ستیہ گرہ کرنے والی ڈیڑھ ہزار خواتین پر لاٹھیاں چلائی گئیں، جس میں قیادت کرنے والی خاتون کا سر پھٹ گیا تھا، اس کے باوجود وہ بے ہوش ہونے تک اس ریلی میں شامل خواتین کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔

گاندھی جی کی نمک قانون توڑو تحریک میں ملک کی لاکھوں خواتین نے حصہ لیا اور اس میں شرکت کی اور اس کو وسیع پیمانے پر پھیلا دیا۔ اس قومی تحریک میں خواتین نے پولیس کی وحشیانہ کارروائی کا بھی مضبوطی سے سامنا کیا۔ خاتون نے ثابت کیا کہ وہ شریف ہے لیکن کمزور نہیں۔ طاقتور عورت کا نام ماں، بہن، بیوی، محبوبہ ہے، جہاں وہ مرد کو جذباتی مدد فراہم کرتی ہے وہیں ضرورت پڑنے پر لاٹھیوں کا زور بھی برداشت کرنے کے قابل ہے، یہ قوم کو طاقت فراہم کرنے کے لائق بھی ہے۔

پھول نہیں چنگاری ہے، یہ بھارت کی ناری ہے۔

(ہندی سے ترجمہ: عبدالحی، قومی اردو کونسل، نئی دہلی)

□□□

Dr. Kamini Verma
538K/154E, Triveni Nagar-1
Nirala Nagar, Seetapur Road,
Lucknow-226020 (U.P)

ڈاکٹر مسرت جہاں

'فریادِ داغ' اور داغ دہلوی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی زبان و محاورے کے شاعر تھے۔ موضوع کے اعتبار سے حسن و عشق اُن کے میدان رہے جہاں انھوں نے خوب سے خوب تر جلوے بکھیرے ہیں۔ الفاظ کے خوبصورت، برجستہ اور برمحل استعمال کے ساتھ روزمرہ کو برتنے میں داغ نے جو کمال کر دکھایا وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اُن کی مثنوی ''فریادِ داغ'' اُن کے مخصوص رنگ میں شرابور ہے۔ شروع سے آخر تک داغ کا مخصوص رنگ عیاں ہے اور اُس رنگ کا جادو ہر جگہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مطالعہ داغ فریادِ داغ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

داغ ایک زود نویس اور بسیار نویس شاعر تھے۔ بسیار نویسی کی مثال اُن کے سولہ ہزار غزلیہ اشعار اور کم و بیش چار ہزار دیگر اشعار ہیں جن میں شہر آشوب اور مثنوی شامل ہے۔ زود نویسی کی مثال خود مثنوی ''فریادِ داغ'' ہے جس کے تقریباً ساڑھے آٹھ سو اشعار داغ نے محض دو دن میں نظم کر دیے۔

داغ کا اپنا ایک فکری زاویہ اور مطمحِ نظر ہے۔ شاعری میں موضوعات کی رنگارنگی اور تنوع کے بجائے گہرائی اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔ معاملہ بندی اور عشق ان کے اہم موضوعات ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا عہد ان خصوصیات سے بھرا ہوا ہے بلکہ عہد کے ساتھ ساتھ اُن کے نجی ماحول کا بھی کافی عمل دخل رہا۔ داغ کی پرورش و پرداخت بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی جہاں گھنگھروؤں اور پائلوں کی جھنکار، ڈھولک کی تھاپ اور طوائفوں کا ساتھ معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ داغ کی والدہ اور خالہ نے بھی ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں کو اس وقت پھانسی دے دی گئی تھی جب اُن کے فرزند داغ محض پانچ سال کے تھے۔ کچھ برسوں بعد داغ کی والدہ مرزا فخرو سے وابستہ ہو گئیں اور وہ قلعہ معلی میں پرورش پانے لگے۔ شاہی گھرانوں کے دیگر بچوں کی طرح داغ نے بھی مختلف علوم و فنون کی تربیت حاصل کی۔ مثلاً گھڑ سواری، تلوار بازی، سپہ گری، خوش نویسی وغیرہ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ دربار فہیم و فریس اور دور اندیش وزیروں سے بتدریج خالی ہو رہا تھا۔ بادشاہ کی حکومت محدود ہوئی جاتی تھی۔ انگریزوں کے تسلط و تغلب اور بے جا پابندیوں نے شاہی درباروں کو محدود و محصور کر دیا تھا۔ اس حصار اور قید و بندکی زندگی سے آزاد ہونے کی کوشش اور حکمت عملی کے بجائے مغلیہ دور کے بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو شراب و شباب میں ڈبو دیا۔ جو حالات تھے، اُسے ہی اپنا مقدر مان لیا۔ مرزا فخرو بھی ایسے ہی ماحول کے پروردہ تھے۔ انھوں نے بچپن ہی سے ایسا سماں دیکھا تھا

جہاں بادشاہت ملک پر حکومت کرنے یا رعایا کے دکھ سکھ کو بانٹنے کے لیے نہیں بلکہ زیست اور عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے کا نام تھی۔ بساط حکومت ماہرین علوم اور یکتائے ہنر سے کہیں زیادہ رقاصاؤں اور ڈیرے داریوں کے لیے بچھائی جاتی تھی۔ اندرون محل عیش و عشرت کے ساتھ گھٹن اور سازش کا ماحول تھا۔ بیرون میں غیر ملکیوں کی اجارہ داری تھی۔ مرزا فخرو بہادر شاہ ظفر کے فرزند تھے جن کی نگہداشت میں داغ نے زندگی کا ایک اہم حصہ گزارا۔ بعد میں جب وہ رامپور منتقل ہوئے تو وہاں بھی ایسے نواب صاحب کی قربت اور ملازمت حاصل ہوئی جو خود ایک شوقین انسان اور حسن و رنگ کے دلدادہ تھے۔ لال قلعہ میں انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا اس کا اثر ذہن پر ثبت ہو چکا تھا۔ رام پور کی زندگی نے تریاق کا کام کیا۔ ان کی تحریریں اس کی بہترین مثال ہیں۔

یہاں اس پس منظر کا بیان اس لیے ضروری تھا کہ داغ اور حجاب کے درمیان تعلقات کے لیے اسی پس منظر نے زمین ہموار کی تھی اور پھر اسی تعلق کے ایک درمیانی واقعے کے طور پر ''فریادِ داغ'' تخلیق ہوئی تھی۔ 838 اشعار پر مشتمل یہ مثنوی 1882 میں قلم بند کی گئی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ 1956 میں تمکین کاظمی نے اسے ایک مبسوط اور وقیع مقدمے کے ساتھ آئینہ ادب، چوک انارکلی، لاہور سے شائع کیا۔

تمکین کاظمی لکھتے ہیں:

''غدر سے پہلے ہندوستان میں طوائف سوسائٹی کا جزو سمجھی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ طوائف سے مراد ان دنوں فحش پیشہ عورتیں نہ تھیں بلکہ وہ خاص طبقہ تھا جو گانے ناچنے کے فن کا ماہر مجلسی علم سے واقف اور تہذیب و تمدن کا نمونہ ہوتا تھا۔ اس طبقے کا رہن سہن اس کا رکھ رکھاؤ اس کی طرز معاشرت خاص تھی۔ شرفا اس سے خلا ملا رکھنا برا نہ سمجھتے تھے۔ ہر امیر، ہر رئیس، ہر شریف شخص کے پاس ایک طوائف نوکر تھی جو روزانہ ایک خاص وقت تک کے لیے آتی۔ گانا سناتی یا تھوڑی دیر اپنی بذلہ سنجی سے دل بہلاتی تھی، بڑے سے بڑے مولوی بھی طوائف سے ملنا معیوب نہ سمجھتے تھے۔ پھر ڈیرہ دار طوائفیں ان میں بھی خصوصیت اور اعزاز رکھتی تھیں۔''

آگے فرماتے ہیں:

''ایسی ہی ایک ڈیرہ دار طوائف منی جان حجاب تھی جس سے داغ کی ملاقات بے نظیر کے میلے میں ہوئی۔''

(تمکین کاظمی، مثنوی فریادِ داغ، ص۔42)

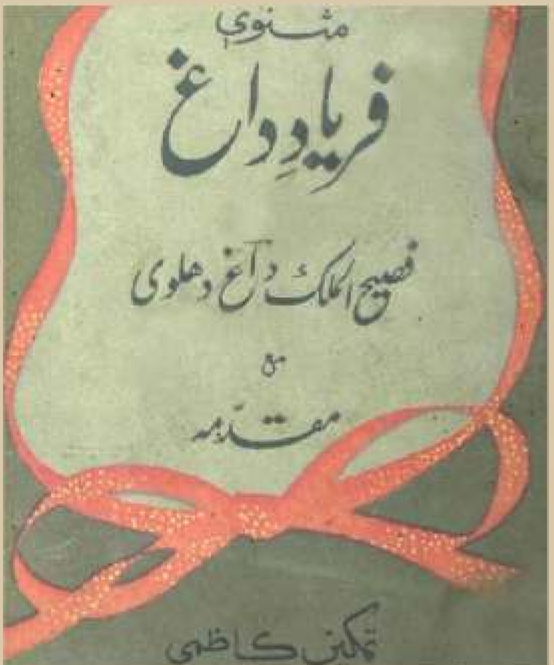

بے نظیر کا میلہ ہر سال ایک باغ میں لگتا تھا جو باغ بے نظیر کے نام سے مقبول ہو گیا۔ اس میلے کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ رامپور کے نواب کلب علی خاں بہادر اپنے شہر کو سجانے سنوارنے اور اس کی ترقی و ترویج کی سعی کرتے رہتے تھے اور اس کے لیے نت نئی ترکیبیں ایجاد کیا کرتے تھے۔ ''بے نظیر کا میلہ'' بھی انھیں کی ذہنی اختراع تھی۔ 1866 سے اس میلے کی ابتدا ہوئی۔ ہر سال مارچ کے آخری ہفتے میں میلے کا آغاز ہوتا تھا اور آخر میں ختم ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی اپریل کے پہلے ہفتے تک وہی دھوم دھام رہتی تھی۔ نواب احمد علی خاں نے ایک کوٹھی بنوائی تھی جس کے اطراف میں ایک سرسبز و شاداب باغ تھا۔ اس کا نام بے نظیر تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اسی میلے میں 1881 میں حجاب اور داغ کا آمنا سامنا ہوا۔ داغ کو حجاب سے محبت ہو گئی۔ مثنوی ''فریادِ داغ'' کے قصے کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی بدولت میلے کو بھی لافانی شہرت حاصل ہو گئی۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آ گیا بے نظیر کا میلا — دل پابند وضع کھل کھیلا
آفت جانِ ناتواں دیکھی — یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا — سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا — آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا

شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کا بیان بہت ہی متاثر کن

انداز میں کیا ہے۔ وہ اپنی مسرت و انبساط کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ اپنے معاملات عشق و سرور میں بھی کو شامل کرنا چاہتے ہوں۔ لکھتے ہیں:

رات کتنی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی ڈلی کیا کیا
جاں نوازی پر اس کو ناز بھی تھا — بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا

شاعر وہ دن اور زمانے کو یاد کر کے بے حد مسرور ہے اور کیف و مستی کا بیان بڑی روانی اور برجستگی سے کرتا ہے۔ ان کے اشعار سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض تخیلات کا مرقع نہیں ہے بلکہ ان میں ذاتی تجربات و مشاہدات شامل ہیں۔ دراصل داغ کو عشق سے فطری میلان تھا۔ اُنھوں نے مثنوی کے ابتدائی حصے میں یعنی اصل قصے سے پہلے ہی عشق کی تعریف کی ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ عشق کی تعریف نہیں کی جاتی ہے لیکن میں اس کی تعریف میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ عشق ہی انسان کو طاقت عطا کرتا ہے۔ دل کو تازہ اور دماغ کو معطر کرتا ہے۔ بزدل بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ اس سے آنکھ اور دماغ روشن ہوتے ہیں۔ اُن کے اشعار دیکھیے:

یہ ہے ٹکسال نقد جاں کے لیے — یہ کسوٹی ہے امتحاں کے لیے

یہ داغ کا فکری نظریہ ہے۔ داغ عشق کو منفرد نظریے سے دیکھنے کے قائل تھے اور اسے زندگی کے لیے لازمی تصور کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے نہ اسے معیوب سمجھا اور نا ہی اس کی پردہ داری کی۔ ان کے عشق میں شدت اور گہرائی ہے۔ ان کا محبوب تصوراتی اور تخیلاتی دُنیا کا نہیں ہے بلکہ حقیقی دنیا کی گوشت پوست کی عورت ہے، جس کا نام حجاب ہے۔ اُنھوں نے جسے چاہا، اُس سے کھل کر ملے اور پھر اس کا برملا اعتراف و اظہار کیا۔

بے نظیر کے میلے کی سیر کے بعد حجاب واپس کلکتہ چلی گئیں۔ ایک سال بعد 1882 میں جب میلہ دوبارہ لگا تب حجاب کو داغ نے آنے کی دعوت دی اور وہ آ گئیں۔ اس ملاقات نے ان کے رشتے کو مزید مضبوطی عطا کی۔ مثنوی میں حجاب کے دوبار کلکتے سے آنے کا ذکر موجود ہے اور ایک دفعہ داغ نے کلکتے کا سفر کیا۔ داغ کے کلکتے کا سفر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کہانی کے زاویے سے دیکھا جائے تو محبوب دعوت قبول کرتے ہوئے سفر کرتا ہے اور مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ ادبی زاویے سے سفرِ داغ کی ایک الگ ہی اہمیت ہے جو دلی، لکھنؤ کانپور، الہ آباد اور عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے:

چل کے دلی سے لکھنؤ پہنچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا
بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے — مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے
خواب انجم نے میہمانی کی — اور بھی سب نے مہربانی کی
راہ میں کانپور، الہ آباد — میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آ گیا عظیم آباد — تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

داغ کا یہ سفر بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ انھوں نے شہروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھنؤ دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا ہے چونکہ وہاں ایک زمانے میں نوابین اور ان کی حویلیاں ہوتی تھیں لیکن آج صرف اجڑی ہوئی علامتیں باقی ہیں۔ داغ نے عظیم آباد کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

بہت اشخاص یک بیک آئے — اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لیے ہی جاتا تھا — کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا میرے گھر چلیے — آیئے اس طرف ادھر چلیے

تقریباً ڈیڑھ ماہ عظیم آباد میں رہنے کے بعد داغ کلکتہ پہنچ گئے جہاں بلاشبہ اُنھیں بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ کلکتے کی تعریف میں لکھتے ہیں:

آئی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

داغ گرچہ حجاب کے لیے کلکتہ گئے تھے لیکن وہ شہر بھی اُنھیں بہت پسند آیا۔ وہاں کے لوگوں نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ حجاب سے اُن کی ملاقات ہوتی ہے اور مرادیں بر آتی ہیں۔ اُن کا وہاں اتنا دل لگ گیا کہ اُنھوں نے اپنی چھٹی میں دو مہینے کی توسیع کی درخواست کر ڈالی۔ البتہ منظوری صرف ایک مہینے کی ہی ہوئی۔ بہر حال یہ وقت بھی گزر گیا اور رُخصت کی گھڑی آ پہنچی۔ داغ بادل ناخواستہ کلکتے سے واپس ہو گئے۔ اس کیفیت کا اظہار اُنھوں نے بڑے ہی دلدوز انداز میں کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

اُنھیں جب معلوم ہوا کہ اب تو بس واپس ہو ہی جانا ہے' اُس وقت کی کیفیت دیکھیے:

میری رُخصت کے دن تمام ہوئے
عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے

اس طرح کس طرح سے رہ جاتے
ہوئے باون برس نمک کھاتے

(یہاں 52 برس ۔۔۔ اُن کی عمر سے مراد ہے، نہ کہ نواب رامپور کی ملازمت سے۔۔۔ اُس وقت نواب رامپور کی ملازمت کے 17 سال ہی ہوئے تھے۔۔۔ بہر حال)

داغ نے جب حجاب کو اپنی روانگی کی اطلاع دی، اُس وقت کی کیفیت کچھ اس طرح تھی:

میری رُخصت سے اُن کو حیرت تھی
کہ یہ رُخصت نہ تھی قیامت تھی

فکر تشویش رنج تھا غم تھا
عوضِ نغمہ شور ماتم تھا

اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے
پاس بیٹھے تو منھ بنائے ہوئے

اور جب داغ رخت سفر باندھتے ہیں، اُس وقت کی کیفیت:

دل سے اپنے یہ گفتگو باہم
کیا رہے آئے کیا چلے کیا ہم

میں کہاں گریہ شبانہ کہاں
سر کہاں سنگ آستانہ کہاں

آبرو کا خیال آتا ہے
عرقِ انفعال آتا ہے

جب وہ کلکتے سے واپس آتے ہیں تو اُن سے غمِ فُرقت برداشت نہیں ہوتا ہے۔ شب و روز بے چین رہتے ہیں اور اُسی عالم میں ''فریاد داغ'' لکھ کر اپنی محبت کی داستان اور دلِ مضطرب کی پوری کیفیت رقم کردیتے ہیں۔ بقول گیان چند جین:

''فریاد داغ دلّی کی آخری مشہور مثنوی ہے۔ زبان، بیان اور جذبات کے لحاظ سے یہ حکیم شوق کی مثنویوں کے قریب آجاتی ہے۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ جلد دوم۔ ص362۔ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی۔اشاعت دوم1987)

داغ نے ''فریاد داغ'' میں جہاں تک اپنی محبت کا ذکر کیا ہے اصل زندگی میں معاملہ اُس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ داغ کے خطوط اور مختلف محققین کے مضامین سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ داغ جب نواب رامپور کے انتقال کے بعد حیدرآباد منتقل ہوجاتے ہیں اور اُن کے حالات پھر سے بہتر ہوجاتے ہیں۔ فارغ البالی کا دور شروع ہوتا ہے تو داغ ایک بار پھر حجاب کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اِس دوران حجاب اپنا گھر بسا چکی ہوتی ہیں مگر داغ کے اصرار پر وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر حیدرآباد آجاتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ مثنوی داغ کی حیات، مزاج اور شاعری کو سمجھنے میں بہت معاون اور مددگار ہے۔ اس میں داغ کی شاعرانہ خصوصیات اور اُن کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ سر عبدالقادر کا یہ اقتباس اس خیال کو مزید تقویت عطا کرتا ہے:

''ہر شعر حشر جذبات اور واردات قلبی کا نچوڑ ہے۔ وہ اشعار جن میں داغ محبت کا اظہار کرتے ہیں اس قدر پر لطف ہیں کہ ان کے خلوص' زور اور صداقت کے لحاظ سے بمشکل ان کے کسی ہم عصر کو یہ بات حاصل ہوسکتی ہے۔۔۔۔ ان لوگوں کو جنھوں نے اس مثنوی کو اب تک نہیں پڑھا ہے میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ضرور پڑھیں اور اس کے محاسن کے متعلق خود اپنی رائے قائم کریں۔ میری رائے میں اس مثنوی کا ادبی مقام بہت بلند ہے۔ اگرچہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کے بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔'' (بحوالہ تمکین کاظمی۔ فریاد داغ۔ ص37-36)

Dr. Mosarrat Jahan
Assistant Professor
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032 (T.S)

ڈاکٹر شیخ ریحانہ بیگم

مہ لقا چندا

دکن کی اولین نسائی آواز

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سیاست ہو یا سائنس، رقص وموسیقی ہو، یا ادب لطیف، خواتین کو جب بھی اظہار کے مواقع میسر آئے انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنا نام تاریخ میں درج کروایا۔ سرزمینِ دکن پر صوفیوں اور سنتوں کے ساتھ ساتھ ایسی ہستیوں نے بھی جنم لیا جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف کی بنیاد رکھی۔ جہاں قلی قطب شاہ دکن کا پہلا صاحب دیوان شاعر رہا ہے وہیں پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز اور دوسری صاحب دیوان شاعرہ مہ لقا چندا بھی سرزمینِ دکن سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ مہ لقا چندا عرصۂ دراز تک اردو کی اولین صاحب دیوان شاعرہ سمجھی جاتی رہی ہیں۔ صفا عبدالحئی لکھتے ہیں کہ:

''عورتوں میں سب سے پہلے اردو میں اسی عورت نے اپنا دیوان مرتب کیا۔'' (تذکرہ شمیم سخن۔ صفا عبدالحئی، ص 81)

اس کے علاوہ محی الدین قادری زور نے دبستانِ ادب حیدر آباد، تسکین عابدی نے سخنورانِ دکن، آسی عبدالباری نے ''تذکرۃ الخواتین' میں چندا کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ قرار دیا لیکن مولوی نصیر الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق:

''لطف النساء امتیاز کا دیوان 1212ھ میں آچکا تھا اور مہ لقا چندا کا دیوان ان کے ایک سال بعد 1213ھ میں مرتب ہوا۔'' (خواتین دکن کی اردو خدمات۔ نصیر الدین ہاشمی، ص 230)

مہ لقا چندا کا نام ان کی نانی کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ ان کے والد کا نام بہادر خان تھا وہ ترکی النسل بلخ کے ایک معزز گھرانے کے فرد تھے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''مہ لقا کے والد کا نام مرزا سلطان نظر تحریر کیا جو ان کے دادا تھے۔'' (پروفیسر شفقت رضوی۔ دیوان مہ لقا، ص 3)

مہ لقا چندا کے دادا مرزا سلطان نظر عالمگیر کے دربار میں شہزادۂ معظم کے وکیل تھے۔ مہ لقا کی والدہ کا نام راج کنور بائی (میدا بی بی) تھا جو گجرات کے ایک مرشد گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔ مہ لقا چندا کے

نانا خواجہ محمد حسین تھے انھوں نے گجرات کی حسین لڑکی چندا بی بی سے شادی کی تھی۔ محمد حسین صدر محاسب کے عہدہ پر فائز تھے۔ جوے کے شوق کے سبب ان پر ہزاروں روپے کے غبن کا الزام لگا۔ ناظم گجرات نے گرفتاری کا حکم دیا تو محمد حسین بیوی بچوں کو چھوڑ کر روپوش ہو گئے تھے۔ محمد حسین کے روپوش ہوجانے کے بعد چندا بی بی اپنے بچوں کے ہمراہ دیولیہ (جو بھگتوں کا ایک محلہ تھا) چلی آئی۔ بھگتوں کا پیشہ گانا بجانا تھا۔ چندا بی بی کی تین بیٹیاں تھیں نور بی بی، بولن بی بی اور میدا بی بی۔ نور بی بی اور بولن بی بی نے موسیقی اور رقص میں مہارت حاصل کی۔ تیسری بیٹی میدا بی بی نہایت حسین وجمیل تھی اسی لیے دیولیہ کے راجہ سالم سنگھ نے اسے اپنے محل کی زینت بنالیا۔ راجہ سالم سنگھ پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اسی لیے محل سرا کے آپسی تنازعات دشمنی میں بدل گئے۔ ڈر اور خوف کے سبب بھگتوں کے مشورے پر میدا بی بی اپنے دو بھائیوں اور بہنوں کے ہمراہ مالوہ کے راستے دریائے نربدا عبور کر کے دکن پہنچیں۔ کچھ عرصہ برہان پور میں رہنے کے بعد اورنگ آباد پہنچ کر رقص وموسیقی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ سالم سنگھ کے ڈر سے یہاں آکر انھوں نے اپنا نام تبدیل کرلیا۔ میدا بی بی کا نام راج کنور بائی، نور بی بی کا برج کنور بائی اور بولن بی بی کا بولن کنور بائی رکھا۔ برج کنور بائی اور بولن کنور بائی گھر چلاتی تھیں، راج کنور بائی گھر پر رہتی تھی۔ راج کنور بائی (میدا بی بی) اور سالم سنگھ کی بیٹی مہتاب کنور بائی تھی جو بے حد حسین تھی۔ مہتاب کنور بائی کا بیاہ نواب احتشام جنگ رکن الدین مدار المہام مملکت سے ہوا۔ مہتاب کنور بائی کو صاب جی صاحبہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ مہتاب کنور بائی کی شادی کے بعد راج کنور بائی (میدا بی بی) نے مرزا سلطان نظر کے فرزند نواب بسالت خان بہادر آصف جاہی بخشی صرف خاص سے نکاح کرلیا تاکہ زمانے کی ہوس ناک نگاہوں سے بچ کر اپنی زندگی عزت سے گزارے۔ اس وقت نواب بسالت خان بہادر کی عمر 55 سال تھی۔ ان سے راج کنور بائی (میدا بی بی) کے گھر مہ لقا چندا پیدا ہوئیں۔

"مہ لقا بروز دوشنبہ 20/ذی قعدہ 1181ھ کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی۔" (غلام صمدانی گوہر۔ حیات ماہ لقا ص۔20)

ان کی پیدائش پر بڑی دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ چھٹی اور عقیقہ کی رسم بھی بڑے تزک واحتشام سے منائی گئی۔ مہتاب کنور بائی اور رکن الدولہ کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لیے انھوں نے چندا کو گود لے کر اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔ مہ لقا کی تعلیم وتربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی، فن حرب میں مہارت حاصل کی۔ وہ بہترین شہ سوار، تیر انداز، نیزہ باز اور شمشیر زن قرار پائی۔ ہتھیاروں سے لیس ہوکر میدان جنگ میں مردانہ لباس پہن کر جایا کرتی۔ عربی، فارسی اور بھوجپوری زبان سے بخوبی واقف تھی۔ فارسی میں شاعری بھی کی تھی مگر کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ موسیقی میں مشہور موسیقار خوشحال خان کی شاگرد تھیں (خوشحال خان کریم خان کے بیٹے تھے جس نے "راگ راگنی شب وروز" نامی کتاب لکھی)۔ مہ لقا چندا کو دھرپد، خیال اور ٹپہ میں کمال حاصل تھا اور اس میں اس نے کئی اضافے بھی کیے۔ مہ لقا کے دادا، والد، والدہ متقی اور پرہیزگار، سیرت اور صورت میں اپنی مثال آپ تھے۔ غلام حسین خان جوہر (مصبدار) نے مہ لقا کی فرمائش پر ان کے کتب خانے سے استفادہ کر کے 1228ھ میں فارسی زبان میں ایک تاریخ لکھی اور چندا کے نام پر اس کا نام "ماہنامہ" موسوم کیا جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں آج بھی موجود ہے۔ اس تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مہ لقابائی کے جد اعلیٰ، قوم چغتائی برلاس سے تھے۔ مہ لقا تُرکی الاصل تھی اس لیے حسن وجمال میں بھی بے مثال تھی۔ مہ لقا رکن الدولہ مدار المہام کی آغوش میں پلی بڑھی، تمام زندگی شاہی درباروں میں گذری، نواب ارسطو جاہ مدار المہام نواب میر عالم مدار المہام، مہاراجہ چندو لال شاداں مدار المہام اور امیر اعظم مہاراجہ راؤ رنبھا صاحب کی مصاحبت میں زندگی گذری۔ تمام امراء دکن مہ لقا چندا کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ چندا نے کم عمری ہی سے مختلف معرکوں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ 1196ھ میں آصف جاہ ثانی نواب نظام علی خان کے ساتھ "کولاس مہم" کی واپسی کے بعد چندا کو "مہ لقا" کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کے نام اور تخلص پر کئی اعتراضات سامنے آتے ہیں۔

1۔ عبدالحی صفا نے "تذکرہ شمیم سخن" میں نام ماہ لقا اور تخلص بھی ماہ لقا بتایا۔

2۔ عبدالباری آسی نے تذکرۂ اقوانین میں ماہ لقا تخلص اور ماہ لقا نام بتایا۔

3۔ سید علی اصغر بلگرامی نے مآثر دکن میں ماہ لقابائی عرف چندا بائی لکھا۔

4۔ کوہ مولا علی کے عقب میں صدر دروازے کے اندرونی حصہ پر ایک کتبہ نصب ہے جس میں "خطابش مہ لقا عرف چندا بائی" لکھا ہے۔

5۔ راحت عزمی نے 'چندا بی بی' نام، تخلص 'چندا' اور 'ماہ لقا' خطاب بتایا۔

6۔ حکیم ابوالقاسم (قدرت اللہ قاسم) تذکرہ "مجموعہ نغز" میں لکھتے ہیں:

"چندار قاصہ زنے است روشن اندام مہ لقانام۔۔۔"

7۔ درگا پرشاد اپنے تذکرہ "تذکرۃ النساء" میں لکھتے ہیں:

"ماہ لقابائی نامی ایک طوائف ملازماں چندو لال صاحب مرحوم و مغفور کھتری نائب الریاست حیدر آباد دکن کی صاحب دیوان تھی۔"

اس زمانے میں خواتین کا گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ طوائف لگ چکا تھا۔ وہ ایک باکمال فنکارہ تھیں اور حالات کا شکار بھی۔ شاہی دربار اور امراء کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ ماہ لقا چندا چونکہ مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتی تھیں اس کی طرز گفتگو اور آداب واخلاق سے متاثر ہو کر سکندر جاہ نے کہا تھا کہ:

"مانند ماہ لقا دیگرے بہ ایں کمالات پیدا شدن مشکل است"

(دیوان مہ لقا،ص ۲۰-۲۱)

(مہ لقا کی طرح ان کمالات سے مزین کوئی دوسرا پیدا ہونا مشکل ہے)

علما و شعرا کی قدر دان تھیں ان کے کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں۔ دکن میں ان کے ہم عصروں میں شیر محمد خان، چندو لال شاداں، محمد صدیق متین تھے جب کہ شمالی ہند میں میر تقی میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ کی شاعری بام عروج پر تھی۔ وہ سراج اورنگ آبادی کی شاعری سے متاثر تھیں۔ ماہ لقا چندا کے استادوں میں شیر محمد خان ایمان کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن غلام صمدانی گوہر نے میر عالم بہادر کو ان کا استادِ سخن بتایا ہے۔

"ماہ لقا بائی چندہ تلمیذ از نواب میر عالم مدار المہام۔"

(پیش لفظ۔ دیوان ماہ لقا چندا بائی۔ مرتب شفقت رضوی،ص 52)

اور ڈاکٹر زور نے بھی لکھا ہے کہ: میر عالم اسے اپنی شاگرد کہا کرتے تھے۔ مہ لقا چندا کی ذہانت، صلاحیت اور حسن و جمال کو تذکرہ نگاروں نے بہت سراہا ہے۔ میر عالم نے "سراپائے مہ لقا" کے عنوان سے 1223 اشعار پر مشتمل مثنوی لکھی۔ مہاراجہ چندو لال کے دیوان میں مہ لقا چندا کی تعریف میں مکمل غزل ملتی ہے:

نہیں ہے چین بن دیکھے ترے اے مہ لقا مجھ کو
درس کا میں تو پیاسا ہوں، درس اپنا دکھا مجھ کو

غلام حسین جوہرؔ بیدری نے مثنوی "سراپائے مہ لقا" لکھا۔ شیر محمد خان ایمانؔ نے 19 بندوں پر مشتمل مسدس "در تعریف مہ لقابائی" لکھی۔ گوبند بخش ضیائی نے ایک مستزاد "در تعریف مہ لقا بائی" لکھی۔ قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"چندا۔۔۔ بطور مرداں ورزش می کند، واسپ می تازد، واز ناوک وشنہ کاری (خنجر و کٹاری چلانے میں مہارت)، مژگاں درگزاشتہ تیر اندازی و نیزہ بازی میداں می پردازد۔"

(مجموعہ نغز۔ قدرت اللہ قاسم،ص 220)

(چندا۔۔۔ مردوں کی طرح ورزش کرتی، گھوڑ سواری، خنجر بازی، تیر اندازی اور نیزہ بازی میں مہارت کے لیے میدان جایا کرتی تھیں)

انتقال کے بعد باغات و عمارات کے علاوہ ایک کروڑ روپے، سید پلی، حیدر گوڑہ، چندا پیٹھ، پے پہاڑ، علی باغ، اور اڈک پیٹھ اس کی جاگیر میں شامل تھے۔ سید اختر حسین اختر لکھتے ہیں:

"یہ کس قدر دلچسپ اور عجیب بات ہے کہ اگر ایک طرف "مہ لقا" کی امداد، ادب میٹ میں جامعہ عثمانیہ کی بلند و باعظمت عمارتیں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ "حسن لقا" کے مکان اور باغ میں "زنانہ کالج نام پلی" قائم ہے۔"

(مرقع سخن۔ سید محی الدین قادری زور،ص ۱۰۲)

مہہ لقا چندا کی وفات پر مختلف تنقید نگاروں نے اپنی آرا پیش کی۔ ڈاکٹر راحت سلطانہ نے جدید تحقیق کے مطابق کتبہ کے اشعار سے 1809 بمطابق 1240 ہجری تاریخ وفات نکالی۔

("تحقیق و تنقید"۔ جہان اردو۔ 2015)

چندا کی شاعری:

ارسطو جاہ کے حکم سے 1213ھ (1795) میں مہ لقا چندا کا

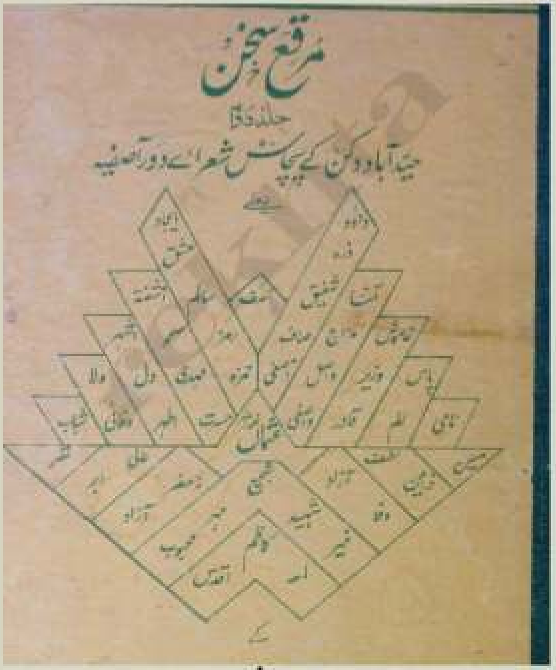

دیوان مرتب ہوا۔ مہ لقا چندا کے تین نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا سالار جنگ حیدرآباد کے سینٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مخطوطات مشرقی کے مخزونہ نسخہ، جس میں 98 غزلیں ہیں۔ دوسرا ''دکن میں اردو'' (ملا نصیر الدین ہاشمی) میں لکھا ہے کہ برٹش میوزیم انگلینڈ میں جو دیوان ہے وہ 1226ھ (1808) میں مرتب ہوا۔ تیسرا شفقت رضوی نے نشان دہی کی ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کتب خانہ پاکستان میں ایک نسخہ ہے جو 48 صفحات پر مشتمل ہے جس میں 107 غزلیں شامل ہیں۔ 1334ھ (1906) میں ''گلزار مہ لقا'' نظام المطابع حیدرآباد سے شائع ہوا جس میں 39 غزلیں اور 5 قطعات شامل ہیں۔ مہ لقا چندا نے صنف غزل ہی میں طبع آزمائی کی۔ وہ ایک قادر الکلام اور اپنے وقت کی ہردلعزیز شاعرہ تھیں۔ مہ لقا چندا کی شاعری میں، افکار عالیہ، کلام میں وسعت و گہرائی، موسیقیت اور دل کو موہ لینے والا لب ولہجہ موجود ہے۔ بلند پایہ ادیبوں اور دانشوروں کی صحبت اور علمی وادبی ماحول نے ان کے افکار کو بلند کر دیا تھا۔

سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''چندا کی شاعرانہ عظمت بظاہر اس کی سوانح حیات کی دوسری مہمات سے بہت کم ہے لیکن اب اردو میں چندا کا نام صرف اس کی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے اور رہے گا۔''

(مرقع سخن۔ سید محی الدین قادری زور، ص 105)

مثل مشہور ہے کہ: ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ آں کہ عطار بگوید''

قلمی دیوان ''دیوانِ چندا'' میں 125 غزلیں شامل ہیں۔ 118 غزلوں کے مقطع میں حضرت علیؓ سے عقیدت کا اظہار ہے ہر غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اپنی غزلوں کے مقطعوں میں حضرت علیؓ کے نام کا استعمال ان کی عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کے ذکر کے ساتھ دین و دنیا، زندگی اور آخرت کا ذکر کیا ہے وہ دونوں جہاں میں سرخروئی کی خواہش مند تھیں:

سرخرو ہرگز نہ ہو چندا کسی سے دہر میں
یہ جناب مرتضیٰ کی ہے کنیزی کا غرور

چندا کو بخش یا علی اپنے جناب سے
رتبہ جو دوجہاں میں ہو اقتدار کا

یا علی حشر میں دو چندا کو
آب کوثر کی خوشگوار شراب

سو جان سے ہوگی وہ تصدق مرے مولا
چندا کی جو کونین میں امداد کروگے

یہ ہی مراد و مقصد ومطلب ہے یا علی
چندا پہ لطف و رحم ہو ہر دوسرا کے بیچ

جس طرح مہ لقا چندا کی تعریف میں ان کے ہم عصر شعراء کا کلام ملتا ہے اسی طرح مہ لقا کی غزلوں میں ان کے کرم فرماؤں کا ذکر بھی موجود ہے۔ نظام الملک آصفجاہ ثانی کی مدح میں دو مکمل غزلیں ملتی ہیں جن کے مطالعہ سے اس زمانے کے واقعات اور ان کی حیات پر روشنی پڑتی ہے:

بھلا اب کوئی ہو کیا شان وشوکت میں، تیرے ہمسر
کھڑے ہوں دست بستہ سامنے جو قیصر و خاقاں
یہی مشہور عالم ہے گدا سے شاہ تک باہم
ترے خوان کرم پر کون ہے وہ جو نہیں مہماں

(غزل نمبر۔92)

بسنت آئی ہے موج رنگ گل ہے جوش صہبا ہے
خدا کے فضل سے عیش وطرب کی اب کمی کیا ہے

خضر کی عمر ہو اس کے تصدق سے ائمہ کے
نظام الدولہ آصفجاہ جو سب کا مسیحا ہے

بھی خوان کرم سے ہے صدا امید چندا کو
کسی کی بھی نہ ہو محتاج تم سے یہ تمنا ہے

(غزل نمبر_123)

ارسطو جاہ کی تعریف:

مدعا چندا کا ہے یہ اب ارسطو جاہ سے
فیل وزر بخشی تو جاگیر کا بھی ہو شمار

(غزل نمبر_52)

مہ لقا چنداؔ کے کلام میں بلا کی موسیقیت موجود ہے انہی اوزان کو اپنی غزلوں میں زیادہ برتا ہے جن میں نغمگی ہے کیوں کہ سُرتال ان کی رگ رگ میں پیوست تھے:

شاہ و گدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر
عاشق ہے نیم جان نئی لے سے تان بھر

مہ لقا چنداؔ نے صوفیا کرام کے عقیدے (ہمہ اوست/ہمہ ازوست) کو مختلف پہلوؤں سے باندھا اور غزلوں میں مسائل تصوف کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے: ''وہ سراج سے متاثر تھیں جس کا اثر ان اشعار میں دکھائی دیتا ہے''

روزِ ازل جو جام محبت پلا دیا
سرخی رہی ہے آنکھوں میں اب تک خمار کی

ہماری چشم نے ایسا کمال پایا ہے
جدھر کو دیکھیے آتا ہے تو نظر ہم کو

ادا شرطِ عبادت ہو سکے ہے کب بھلا اس کی
خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد تک پہنچے

ان کے کلام میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ عمدہ تشبیہوں اور صنعتوں کا استعمال بھی ملتا ہے جو تخیل کی انتہائی نزاکت اور لطافت کو ظاہر کرتا ہے۔ اکثر اشعار محاکاتی ہیں۔ درج ذیل کلام میں ندرت، سادگی اور صفائی محل نظر ہے ساتھ ہی حسن تعلیل کی عمدہ مثالیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں:

حسن کے شعلے سے ترے جب کہ ٹپکے ہے عرق
شرم سے بس ابر کے دامن میں ہے تر آفتاب

جو دیکھا یار کے عارض پہ میں نے خال تاباں کو
کہی بھبتی کہ یہ ہندو کرے ہے حفظ قرآں کو

خلش تیر مژگاں کی دل میں ہے یوں
کھٹکتا کہیں جیسے نشتر رہے

کچھ کچھ نظر آتی ہے جو سیماب میں تڑپ
سیکھی ہے طرز، دل سے مرے اضطراب کی

مہ لقا چندا نے یقیناً تفریحاً شعر کہے ہیں لیکن ان کی شاعری میں عامیانہ خیالات نہیں ملتے۔ ان کے اشعار ذاتی خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے اشعار میں لازوال سکون، شہرت اور دولت کی آرزوؤں کا اظہار ہے۔ خیال کی ندرت، بیان کی لطافت و بے ساختگی کی مثالیں دیکھیے:

تم منہ لگا کے غیر، کو مغرور مت کرو
لگ چلنا ایسے ویسوں سے دستور مت کرو

گل کے ہونے کی توقع میں جیے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

دل میں میرے پھر خیال آتا ہے آج
دل ربا جل بے مثال آتا ہے یاد

حسن و عشق کے واردات و معاملات، معشوق کے حسن کا سراپا ہماری غزل کے موضوع رہے ہیں۔ عشق کے پاک اور سچے جذبات کا اظہار مہ لقا کے پاس بھی ملتا ہے:

سوائے بندگیِ رب نہیں مطلب دل سے
غرض اکرام سے مجھ کو نہ انعام کی خواہش

ہر چند راہِ عشق میں دل پائمال ہے
روز جزا میں رتبہ ہے اس انکسار کا

مندرجہ ذیل اشعار میں موسیقی اور مصوری کی ہم آہنگی دیکھیے:

شاخ گل میں کب ادا ہے وہ چمن کی ساقیا
خوشنما جیسا ہے تیرے ہاتھ میں یہ جامِ سرخ

مہ لقا چنداؔ کے اخلاق و اعلیٰ اقدار، دردمندی، دوستی، ہمدردی، کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

ہر چند دل دکھانا کسی کا برا ہے پر
رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو

ہو اس میں زرق برق زمانے کا، الغرض
ہے ذی شعور وہ جو کسی دل میں جا کرے

جس نے کی تحقیق ہر دم چشم دل سے یار کی
مرد حق ہے اس جہاں میں ، ہے وہی صاحب شعور

شفقت رضوی لکھتے ہیں کہ:

"مہ لقا چندا کی زیادہ تر غزلیں روایتی انداز میں ہیں لیکن ان میں بھی اس کی انفرادی شان موجود ہے۔جس میں سب سے نمایاں اس کا لب ولہجہ ہے۔یوں تو سیکڑوں خواتین نے غزل گوئی کی ہے لیکن اس میں کسی کے یہاں نسوانیت نہیں ملتی۔ان سب نے مردانہ لہجہ ہی میں اپنے جذبات کو پیش کیا ہے۔"

(شفقت رضوی۔ تحقیقی نقوش۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی۔ کراچی 1995، ص123)

خواتین شاعرات میں چنداؔ پہلی شاعرہ ہے جس نے نسوانی لب ولہجہ میں شاعری کی اور ایسے محاوروں کا استعمال کیا جو خواتین زیادہ استعمال کرتی ہیں۔محاوروں کے استعمال کے ساتھ ساتھ زبان کی شیرینی، شگفتگی اور سلاست کی چند مثالیں پیش ہیں جس میں چندا کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے:

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے

کہاں سمجھانے سے سمجھے ہے ناداں، قدر تو دل کی
نہ تو، جب تک پڑے ظالم، کسی بے درد کے پالے

مہ لقا چنداؔ کے یہاں روایتی عورت کی تصویر کے ساتھ ساتھ رومانی و داخلی جذبات اور نسائی احساسات بھی موجود ہیں۔اختر حسین لکھتے ہیں کہ:

"اردو زبان کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ اس کا دامن عورتوں کے افکار ادبی و شعری سے مالا مال ہے۔چنداؔ کا اندازِ بیان نہایت شیریں اور پر لطف ہے۔اس نے اب تک ضمائر تانیث کا استعمال کیا ہے اور یہ خصوصیت اس کو تمام اردو میں شعر کہنے والی عورتوں سے ممتاز کرتی ہے۔"

(اختر حسین، مضمون مہ لقا بائی چندا بائی، مشمولہ مرقع سخن، جلد اول ص91)

جو پوچھے ہجر کی حالت مری وہ بے وفا ہنس کر
تصدق ہو کے کہہ با آہِ سرد و چشمِ تر قاصد

سو جان سے ہوگی وہ تصدق مرے مولا
چندا کی جو کونین میں امداد کروگے

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے

کہ دکن کی شعری روایت میں مہ لقا چندا ایک اہم نام ہے۔ان کی کاوشوں کو محض تاریخی نہیں بلکہ معاشرتی اور نظریاتی نقطۂ نظر سے بھی پرکھا جانا چاہیے۔مہ لقا چندا کا زمانہ اٹھارویں صدی عیسوی ہے۔دکن کی اس شاعرہ نے صرف روایتی قسم کے اشعار کہنے پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہی محض صنف نازک کے جذبات واحساسات کی عکاسی کو اپنا مقصد بنایا۔دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب تانیثیت کی بحث نہ تو شمال کے کسی شاعر کے پاس ملتی ہے اور نہ جنوب کے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مہ لقا چندا تانیثیت کے کچھ بنیادی وسائل بروئے کار لائی جن میں بطور خاص تانیثی ضمائر کا استعمال ہے۔دکن کی ادبی روایت میں اگر تانیثیت کی جڑوں کو تلاش کرنا مقصود ہو تو۔۔۔(بعد ازاں جن کا اظہار واجدہ تبسم، شفیق فاطمہ شعریٰ، رعنا حیدری۔۔۔کے پاس ملتا ہے) علمی اعتبار سے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ہم مہ لقا چندا کی شاعری کا از سر نو محاسبہ کریں کیوں کہ مہ لقا چندا کی شعری کاوشوں کی تحقیق نو سے ادبی بحث کے وہ کارآمد امکانات روشن ہوں گے جن سے شہرہ آفاق شاعرات کی شمعیں روشن ہوئی ہیں۔

□□□

Shaikh Rehana Begum
Office 224, Collector Office Compound,
Near Gulshan Masjid, Gali No. 2
Fazil Pura, Aurangabad-431001 (MS)

ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ

شہزادیٔ دکن: ملکہ حیات بخشی بیگم

سماجی ارتقاء اور انسانی معاشرے کی تشکیل عورت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ عورت کا وجود صرف گھر گرہستی ہی تک محدود نہیں ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کی علم و حکمت، تدبر، بہادری و شجاعت کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں تو وہیں اس نے فنون لطیفہ خاص طور پر ادب و ثقافت اور فن تعمیرات میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ خدمات انجام دیں۔ دکن میں بھی ایسی کئی خواتین اُبھری ہیں جنھوں نے امور خانہ داری سے پرے تاریخ میں اپنی منفرد شناخت بنائی ان ہی میں ایک نام "ماں صاحبہ" ملکہ حیات بخشی بیگم بھی ہیں جنھوں نے اپنی تدبر سیاست، دانائی و فراست کے ساتھ گولکنڈے پر حکومت کی اور رفاہ عام کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیاسی اور سماجی خدمات کی بنا پر حیات بخشی بیگم کا شمار دنیا کی صف اول کی مدبر خواتین میں ہوتا ہے۔

دکن کی مستند کتابوں میں حیات بخشی بیگم کی حیات و خدمات پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔ سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے اور ریختہ اردو ویب سائٹ پر حیات بخشی بیگم کی سوانح حیات، پروفیسر نصیر الدین ہاشمی اور ابو محمد مصلح کا تذکرہ "ملکہ حیات بخشی بیگم" بھی دستیاب ہے۔ خاص طور پر حیات بخشی بیگم کو حیات نگر کو آباد کیے جانے، جامع مسجد حیات نگر کی تعمیر، 125 طلبا پر مشتمل دارالاقامہ کی تعمیر کے علاوہ دیگر رفاہی کاموں کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیات بخشی بیگم سلطنت گولکنڈے کے پانچویں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی چھٹے سلطان، سلطان محمد قطب شاہ کی بیوی اور ساتویں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھیں۔ ابو محمد مصلح حیات بخشی بیگم کی تاریخ ولادت 1001ھ بتاتے ہیں جب کہ پروفیسر نصیر الدین ہاشمی قیاس ظاہر کرتے ہیں کہ حیات بخشی بیگم کی پیدائش 1000ھ حیدرآباد کی تعمیر کے ایک یا دو سال بعد ہوئی ہے۔ عہد قدیم میں شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل اور باصلاحیت اساتذہ مامور کیے جاتے، جو پردے کے پیچھے سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ حیات بخشی بیگم کی تعلیم و تربیت بھی حسب دستور رہی۔ ماں صاحبہ کا نکاح اپنے چچازاد بھائی سلطان محمد قطب شاہ کے ساتھ 1016ھ، ماہ ربیع الاول میں انجام پایا اور سات سال بعد دو لڑکے عبداللہ قطب شاہ، شہزادہ علی مرزا اور لڑکی خدیجہ سلطانہ شہر بانو تولد ہوئیں۔

محمد قطب شاہ کے عہد حکومت میں سلطنت گولکنڈہ ارتقاء پر تھی چاروں طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ شادی کے چار سال بعد ہی محمد قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور حکومت کی باگ ڈور ملکہ حیات بخشی بیگم کے ہاتھ آگئی جس نے 15 سال تک کامیاب حکمرانی کے بعد 12 سال کی عمر ہی میں اپنے بڑے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کو تخت نشین کیا۔ حیات بخشی بیگم ذہین اور فطین خاتون تھیں، خود محمد قطب شاہ اپنی چہیتی بیگم کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کے مشورے پر قلعہ گولکنڈہ کے جواب میں مچھلی پٹنم کے راستے پر حیات نگر اور سرونگر کے درمیان ایک عالیشان قلعہ کی تعمیر شروع کی تھی، زندگی نے وفا نہ کی لیکن قلعے کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

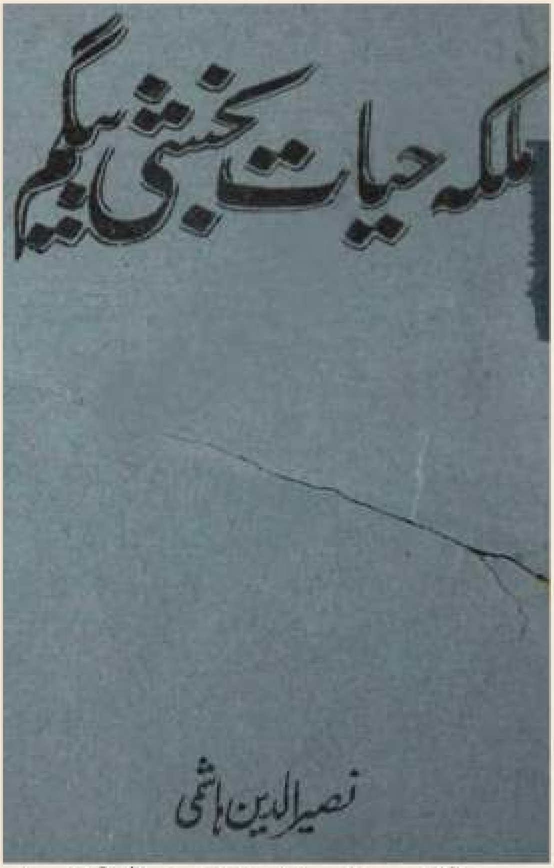

دانائی و فراست، حکمت و تدبر پر مبنی ملکہ حیات بخشی بیگم کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔ سلطان عبداللہ کے عہد حکومت نے شہنشاہ دہلی شاہ جہاں کی طرف سے شہزادہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر صوبے دار دکن نے بعض وجوہات کی بنا پر لشکر کشی کی اور شہزادہ سلطان عبداللہ کو عاجز کر دیا۔ نازک گھڑی تھی گولکنڈہ مفتوح ہونا چاہتا تھا کہ حیات بخشی بیگم نے اپنے حسن تدبر سے جنگ روک دی اور صلح کی غرض سے مردانہ وار مغلیہ کیمپ میں پہنچ گئیں، حضرت اورنگ زیب عالمگیر کو اطلاع ملی تو چند معززین کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور عزت واحترام کے ساتھ انھیں شاہی خیمے تک پہنچایا گیا۔ ملکہ نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور صلح کی خواہش ظاہر کی تو شہنشاہ عالمگیر نے اس خواہش کا احترام کیا۔ چند شرائط کی بنا پر جنگ ٹل گئی اور صلح ہو گئی، ملکہ نے سیاسی اغراض کو مدنظر رکھ کر مغلیہ سلطنت کو دو سال میں ایک کروڑ روپے ادا کرنے اور سلطان عبداللہ کی دختر کا عقد عالمگیر کے شہزادے سلطان محمد سے طے کر دیا۔ شہزادے کے نکاح کے بعد عالمگیر گولکنڈے سے واپس دہلی لوٹ آیا۔ ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ میں حیات بخشی بیگم کے انتظام سلطنت کے تذکرے اس طرح کرتے ہیں۔

"بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم نے جس طرح سیاست کی مدد کی تھی، اسی طرح قطب شاہی تمدن میں بھی اضافہ کیا"

(تاریخ گولکنڈہ، ص، 175)

"عبداللہ کی کمسنی کے زمانے میں اکابر ملک کی ایک مجلس امور سلطنت انجام دیتی تھی لیکن اس مجلس کی روح رواں دراصل عبداللہ کی ماں حیات بخشی بیگم تھی۔ تمام امور اس کے مشورے سے انجام پاتے تھے۔ عبداللہ کی تخت نشینی کا اس نے انتظام کیا اور نظم ونسق کے لیے لائق عہدیدار مقرر کئے"۔

(تاریخ گولکنڈہ، ص 123،124)

حیات بخشی بیگم نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا، نہ قابل فراموش رفاہ عام کے کام کیے جس کا فیض عام آج بھی جاری وساری ہے۔ سخاوت، رحم دلی اور خدا ترسی کی بہترین مثالیں قائم کیں، عالیشان مساجد، مسافر خانے، خانقاہیں آباد کیے، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کے لیے خصوصی اقدام کیے۔

ملکہ حیات بخشی بیگم کا آباد کردہ شہر، حیات نگر: حیات بخشی بیگم نے چارمینار سے کم و بیش 9 میل کے فاصلے پر 1035 میں حیات نگر آباد کیا جو آج شہر حیدرآباد کا ایک گنجان آبادی والا علاقہ کہلاتا ہے۔ حیات نگر ابتدا ہی سے ایک بارونق شہر رہا ہے، ملکہ نے اس شہر میں سرائیں، مساجد اور مدارس تعمیر کروائے، وہ خود اس شہر میں قیام کرتی تھیں۔ حیات نگر میں اپنی رہائش کے لیے ایک قصر تعمیر کروایا اور ایک وسیع باغ کی طرح ڈالی جو خاص باغ کہلاتا ہے، کئی خوشنما حوض تعمیر کروائے جس سے فوارے چھوٹتے تھے۔ آج بھی ان تعمیرات کے آثار باقی ہیں۔

کاروان اور سرائے: حیات نگر میں ایک میر عالم کی سرائے ہے اور دوسری کاروان سرائے ہے، یہ مسلسل کمانیں تھیں جس کا الحاق خانقاہ کی عمارت سے تھا۔ جو تاجر و مسافر گولکنڈہ اور حیدرآباد آتے تھے ان کا قیام

سرائے

ان سرایوں ہی میں ہوتا تھا۔

مساجد: شاہی محلات کے درمیان عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کروائی جو آج بھی قطب شاہی عمارتوں کی تعمیرات، اپنی فن تعمیری اور حسن کاری کے سبب ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس مسجد کی لمبائی 150 فٹ ہے جس پر پانچ عظیم الشان گنبد اور بڑے بڑے ستون ہیں، اس کی دیواریں نایاب

کاری گری سے مزین ہیں، آج بھی اس مسجد میں پنج وقت نمازیں ادا کی جاتی ہیں بلکہ مذہبی تقاریب کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ حیات بخشی بیگم کی تعمیر کردہ عظیم الشان مسجد، مسجد قطب عالم کے نام سے آج بھی فتح دروازہ علاقہ میں موجود ہے۔ مسجد واقع دولت خانہ عالی، محلہ مٹی کے شیر میں آج بھی اپنی شان وشوکت بیان کر رہی ہے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق یہ مسجد خود حیات بخشی بیگم کے محل میں واقع تھی، جب شاہی محل برباد ہو کر ایک محلہ آباد ہو گیا تو مسجد محلے کی آبادی کا حصہ بن گئی، عرصے دراز تک سیدن صاحب اس مسجد میں اسلامی تعلیمات انجام دیا کرتے تھے۔ آج بھی ان کی اولادیں اس کار خیر کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

خانقاہ یوسف جمال و مدرسہ حیات بخشی بیگم: حیات بخشی بیگم نے اپنے مرشد یوسف جمالؒ جو حنفی مسلک کے پیرو کار تھے ان کے لیے اپنے محل اور باغ سے متصل ایک خانقاہ تعمیر کروائی دراصل یہ ایک شاہی مدرسہ تھا جو 125 کشادہ کمروں پر مشتمل تھا، ہر کمرے میں صرف دو طالب علموں کو رکھا جاتا، مدرسے کے روبرو ایک وسیع وعریض صحن بنوایا گیا تھا تاکہ طلباء کھلی فضا میں سانس لے سکیں۔ اس مدرسے کو دکن کی یونی ورسٹی کا درجہ حاصل تھا کیوں کہ قطب شاہی دور کے اواخر تک تعلیمی مرکزیت صرف اسی مدرسے کو حاصل تھی۔ طلباء، اساتذہ اور ملازمین وغیرہ کے لیے صیغہ اوقاف سے تنخواہیں اور وظائف مقرر کیے گئے تھے۔ تاریخ نظامی کے مولف لکھتے ہیں کہ اس مدرسہ کا ماہانہ خرچ دو سو ہون تھا۔ مدرسہ حیات بخشی بیگم میں غربا کی تعداد زیادہ تھی۔

ہاتھی باؤلی: سلاطین جب کبھی کوئی بستی آباد کرتے یا قلعہ تعمیر کرواتے تو سب سے پہلے پانی کا مناسب انتظام کرتے۔ ماں صاحبہ نے حیات نگر کی عوام کے لیے شاہی مسجد اور مدرسے کے احاطے میں ایک عالی شان باؤلی تعمیر کروائی، جس کے اوپر ایک عمارت بھی بنوائی، خوب صورت حوض سے باؤلی کو مزین کیا۔ ان حوضوں میں پانی باؤلی سے ہاتھی کے ذریعے بھرا جاتا اور نلوں کے ذریعے عوام وخواص تک پہنچایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس باؤلی کا ریکارڈ گنیز بک میں درج ہے۔

تالاب ماں صاحبہ: جوبلی ہلز کی پہاڑیوں کے نیچے ایک تالاب بنوایا جس سے اطراف واکناف کے لوگ سیراب ہوتے تھے۔ اس تالاب میں پانی کے ذرائع بند کردیے گئے ہیں۔ خوش نما مکانات کی تعمیر نے اس تالاب کی جگہ لے لی۔ آج بھی یہ علاقہ ماں صاحب ٹینک کے نام سے مشہور ہے۔

ملکہ پور: آصف نگر کے قریب ایک موضع ملکہ پور آباد کیا تھا جو آج گڈی ملکا پور کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ، بی بی کا چشمہ، بی بی کا علاوہ، بی بی کا علم، وغیرہ بھی حیات بخشی بیگم کی یادگاریں ہیں۔

ملکہ حیات بخشی بیگم نے 1077 میں وفات پائی اور ان کا مقبرہ سلاطین گولکنڈہ کے مقبروں کے متصل سلطان محمد قطب شاہ کے گنبد کے قریب واقع ہے۔

Dr. Syeda Naseem Sultana
Assistant Professor
Usmania University College For Women
Kothi, Hyderabad-500095 (T.S)

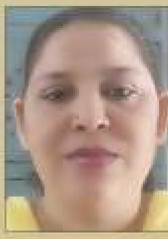

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

نومبر میرا گہوارہ

''نومبر میرا گہوارہ'' علی سردار جعفری کی منظوم خودنوشت ہے، یہ طویل نظم صرف ایک نظم نہیں ان کی عمر کے ستر 70 سالوں پر محیط زندگی کے اوراق پر منحصر ہے، یہ نظم 285 مصرعوں پر مشتمل اور دس حصوں میں منقسم ہے۔ اس نظم میں روایتی اندازِ بیان سے ہٹ کر تبدیلیِ موضوعات کے ساتھ ساتھ، بحروں میں بھی تبدیلی انداز اپنایا گیا ہے۔ پوری نظم بطور آزاد مکالموں کے ساتھ ساتھ تمثیلی شکل میں پیش کی گئی ہے اور اس نظم کا عنوان ان کے ماہِ پیدائش نومبر ہی سے اخذ کیا گیا ہے، اسی لیے شاید علی سردار جعفری نے اپنی نظم کا نام ''نومبر میرا گہوارہ'' رکھا، کیونکہ وہ 29 نومبر 1913 میں ضلع بلرام پور کی پرامن فضاؤں اور ہمالیہ کی ترائی کی آغوش میں پیدا ہوئے۔ اس طویل نظم کی تمثیل علی سردار جعفری خود ہیں۔

اس نظم کا پہلا حصہ 'رقصِ تخلیق' ہے۔ دوسرا حصہ 'کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ' تیسرا حصہ 'اقراء' ہے۔ چوتھا حصہ 'فطرت کی فیاضیاں' پانچواں حصہ 'ذکر اس پری وش کا' چھٹا حصہ 'ورقِ ناخواندہ' ساتواں حصہ 'کائنات' آٹھواں حصہ 'حرفِ بد' نواں حصہ 'حسد' اور دسواں حصہ 'قاتل کی شکست' ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی سردار جعفری اس نظم کے ہر عنوان کے تحت کچھ نہ کچھ متن، ذکر، خیالات اور یادوں کے چراغ جلانا چاہتے تھے اور شاید یہی وجہ ہوگی کہ انھوں نے اس منظوم خودنوشت کو نامکمل کہا ہے۔ اپنے متن کے اعتبار سے یہ نظم زندگی اس کی تربیت، اس کی تعلیم، اس کی شخصیت کا ارتقاء، عشق، عمل، جدوجہد، تجربات، احساسات، معاصرین کا رشک وحسد، لوگوں کا ردِ عمل اور آخر میں زندگی کی فتح اور کامیابی و کامرانی اور حریفوں کی شکست پر مشتمل ہے، اس نظم کے اول ٹکڑے رقصِ تخلیق کے بارے میں علی سردار جعفری نے صرف سات مصرعے کہے ہیں۔

1 جب کہیں پھول ہنسے
2 جب کوئی طفل سرِ راہ ملے
3 رات کی شاخِ سیہ رنگ پہ جب چاند کھلے
4 دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا
5 چیتھڑوں میں ہی سہی ماہ جبیں ہے دنیا
6 دستِ صیاد بھی ہے بازوئے جلاد بھی ہے
7 رقصِ تخلیق جہانِ گزراں جاری ہے

رفعت سروش صاحب علی سردار جعفری کی اس نظم اور اسی حصۂ اول کے اختصار کے متعلق لکھتے ہیں:

''دنیا کی تخلیق اور اس دنیا میں آدمی کا پیدا ہونا ہمیشہ سے ہی مفکروں، دانشوروں، فلسفیوں اور شاعروں کے فکر وفن کا

موضوع رہا ہے، سردار نے اس موضوع پر صرف سات مصرعے کہے ہیں وہ سات سو (700) اشعار کہنے پر بھی قادر تھے، مگر چند مصرعے اور ان میں بھی یہ دو مصرعے۔

دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا
چیتھڑوں میں ہی سہی ماہ مبیں ہے دنیا

''سردار کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں اور ان کی شناخت قائم ہو جاتی ہے''۔

(سہ ماہی نخلستان جے پور صفحہ 24، جولائی تا ستمبر 2000)

ان مصرعوں میں چھپے حوصلہ مند جذبات یہ باور کراتے ہیں کہ اس بھری پوری دنیا میں اہل دولت اور اہل شان و شوکت ہی قابلِ تعریف اور قابل اعتنا نہیں۔ اس مفکر دانشور اور فلسفی شاعر کو ان غربا سے بھی محبت ہے جو مفلوک الحال تو ہیں مگر زندگی کو، حوصلوں کو، امیدوں کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ ان کے احساسات شکستہ حال اور دردمندوں سے وابستہ ہیں۔ ان کو غریب کسانوں، محنت کشوں سے محبت ہے ان کی محنت اور مشقت سے محلوں کی تعمیر ہوتی ہے۔

جن کی کھردرے ہاتھوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے اور یہی وہ رقصِ تخلیق ہے جو دنیا کو سرسبز و شاداب اور ماہ مبین بنائے ہوئے ہے۔ بالکل اپنی نظم کی طرح وہ اپنی کتاب ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' کے پہلے باب ''قبول بندگیم راخدائے بر نمی خیزد'' میں کچھ نثری تحریر میں یوں رقم طراز ہیں:

''مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری، ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے، انسان کے تسلسل میں حیات یاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے''۔ (صفحہ ۱۱)

یہ بالکل سچ ہے کہ کائنات میں ہمیشہ سے ہی تخریبی قوتیں انسانوں اور انسانیت کو پامال کرتی رہی ہیں، تب بھی یہ تخریبی طاقتیں حاوی تھیں جب علی سردار جعفری نے یہ نظم لکھی تھیں اور آج بھی موجودہ دور میں یہ تخریبی قوتیں حاوی ہیں۔ انسانیت اور انسان دونوں کا خون ہو رہا ہے۔ انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہو کر کسانوں پر ظلم کرتی ہے۔ مگر قوت تخریب قوت تخلیق کو آج بھی نہیں روک سکی ہے۔ نہ تخلیق کی گنگا ٹھہری نہ زندگی کی رفتار، رقص حیات جاری ہے اور اسی رقص حیات کا حصہ وہ معصوم بچہ ہے جس کی زندگی کی داستان علامتی انداز میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہ کسی ایک انسان کی زندگی کا قصہ نہیں بلکہ تمام ابن آدم کی داستان معلوم ہوتی ہے۔

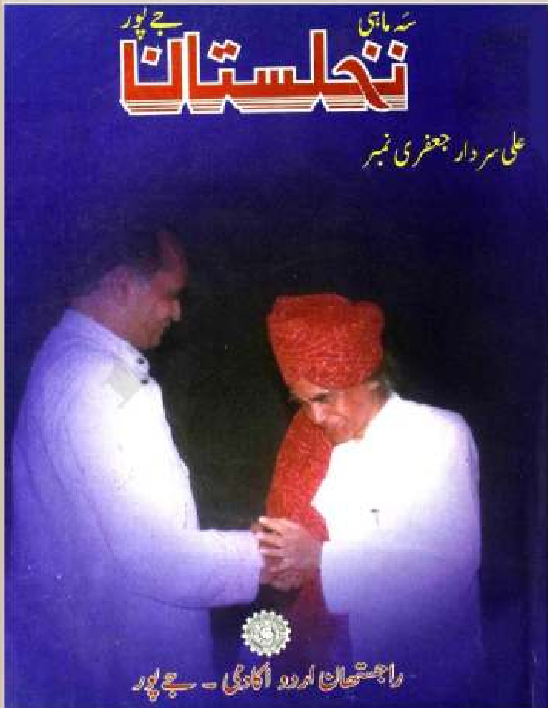

نظم کا دوسرا حصہ ''کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ'' علامہ اقبال کی اس نظم کے مصرعے کی معنویت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جس میں فرشتے ابن آدم کو آنکھ کھول کر دیکھنے کو کہتے ہیں کہ زمین کو دیکھ، آسمان کو دیکھ، ان فضاؤں کو دیکھ، اس احساسات کے ساتھ اس حصۂ نظم میں ایک طفل کی معصومیت، بہت خوبصورت انداز میں اس نظم کا پیکر بنی ہوئی ہے۔ یہ حصہ ذاتی تجربے کاری سے کہیں اوپر تخیل کی فسوں کاری ہے، جس میں تخیل کی پرواز بلند ہے:

میں ستر سال پہلے اس تماشا گاہ عالم میں
اک آفاقی کھلونا تھا
ہوا کے ہاتھ سہلاتے تھے میرے نرم بالوں کو
میری آنکھوں میں راتیں نیند کا کاجل لگاتی تھیں
سحر کی پہلی کرنیں چومتی تھیں میری پلکوں کو
مجھے چاند اور ستارے مسکرا کر دیکھتے تھے
موسموں کی بارشیں جھولا جھلاتی تھیں
میری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو

نظم کے اس حصے میں ایک بچے کی معصومیت کا تمام حسن سمٹ آیا ہے، مندرجہ بالا مصرعوں میں یہیں سے وہ عظیم کردار ابھرتا ہے جو تخلیق کا

سرچشمہ ہے جسے عرفِ عام میں ماں کہتے ہیں۔ یہ ماں صرف شاعر کی ماں نہیں، صرف ایک بچے کی ماں نہیں، بلکہ ہر اس بچے کی ماں ہے، جس نے اس کائنات کی سرزمین پر آنکھیں کھولیں اور جس نے معاشرے اور مذہب کے قانون اور ریتی رواجوں کو اپنا کر رشتوں کے بندھن میں خود کو باندھ کر رشتوں کے تقدس کو قائم کیا۔ تب خود اللہ تعالیٰ اپنے کارخانۂ قدرت سے ایک ذی حیات کو اس کی کوکھ میں ڈال دیتا ہے اور اسی کے خون سے بچے کی آبیاری ہوتی ہے اور پھر وہ بچہ نو ماہ بعد اس اندھیری کوٹھری کے باہر ماں کی گود میں آتا ہے جسے ماں کی گود اور اس کی شفقت و محبت نصیب ہوتی ہے بچے کی ولادت کے بعد ماں کا سب سے بڑا کام بچے کو صحت مند اور تندرست و توانا رکھنے کے لیے اس کی بہتر سے بہتر نشوونما کے لیے اپنا دودھ ہے جو اس کے خون سے تیار ہو کر دودھ بن جاتا ہے اور کہتے ہیں ماں کا دودھ بچے کے لیے آبِ حیات ہوتا ہے۔ خون سے دودھ تک کا رشتہ صرف ماں سے ہی بچے کا ہوتا ہے، ماں کی شخصیت، محبت، محنت، شرافت، عمل اور شوق ان تمام اجزا کو یہ ننھا بچہ اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ پھر کبھی وہ ڈاکٹر، کبھی ماسٹر، کبھی پروفیسر، کبھی کسان، کبھی مزدور، کبھی حافظ تو کبھی شاعر بن جاتا ہے۔ رفعت سروش صاحب لکھتے ہیں:

"بچے کی پیدائش کے بعد ماں کا سب سے بڑا کارنامہ اسے دودھ پلانا ہے۔ یہ ایسا تخلیقی عمل ہے جس پر آج تک اس انداز سے نہیں لکھا گیا جیسا کہ سردار جعفری نے لکھا ہے اور اسی دودھ کی دھاروں سے اس عظیم شاعر کی شخصیت کا انکر پھوٹتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ ماں کے دودھ کی عظمت اس سے بڑے الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی"۔

وہ پاکیزہ مقدس سینۂ زریں
وہ موجِ کوثر و تسنیم تھیں
یا شہد و شبنم تھیں
انہیں کی چند بوندیں آج اعجازِ سخن بن کر
انہیں کی چند بوندیں سحرِ حرف و جادوئے لفظ و بیاں بن کر
مرے ہونٹوں سے خوشبوئے زباں بن کر
سرِ لوح و قلم آتی ہیں تو شمشیر کی صورت چمکتی ہیں
حسینوں کے لیے وہ غازۂ رخسار و عارض ہیں
کھنکتی چوڑیوں، بجتی ہوئی پائل کو اک آہنگ دیتی ہیں
زمیں کی گردشیں، تاریخ کی آوازِ پا میں ڈھلتی ہیں

مشہور فلسفی ارسطو نے کہا تھا۔ "ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہوتا ہے"۔ ماں کی گود اور پالنے کے بعد بچے کی دوسری منزل ہے مدرسہ۔ اس تیسرے حصے میں "اقراء" میں قلم اور علم کی عظمت کا بیان ہے اور عظمت کے وہ احساسات وہ مناظر پیکر اشعار میں ڈھل گئے ہیں جب بچہ پہلا حرف لکھتا ہے۔ اس آپ بیتی میں بھی ہزاروں اور لاکھوں کی جگ بیتی ہے اور یہی اس دانشور شاعر کا کمال ہے:

میری انگلی نے پہلے خاک کے سینے پہ حرفِ اوّلیں لکھا
پھر اس کے بعد تختی پر قلم کا نقشِ ثانی تھا
قلم انگشتِ انسانی کا جلوہ ہے
عروجِ آدمِ خاکی کا دلکش استعارہ ہے

خود سردار جعفری نے لکھنؤ کی پانچ راتیں کے باب اول میں جو ان کی خودنوشت کا حصہ ہے لکھتے ہیں:

"میں اپنے بچپن میں تختی لکھا کرتا تھا جس پر ہزاروں بار نہیں تو سیکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم   قلم کش را بدولت می رسانم

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت اور قلبِ انسانی کی وسعت سمجھا ہے۔ اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے، ممکن ہے کسی کے لیے یہ دولت چاندی، سونا ہو، کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے لیکن میرے لیے یہ علم ہنر، خلوص اور صداقت کی دولت ہے اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے"۔ صفحہ 12

اس طویل نظم کا چوتھا باب "فطرت کی فیاضیاں" ہے۔ یہ اس لڑکے کے کھلنڈرے پن اور بچپن کی مصوری ہے، جس پر اس بچے کو قدرتی مناظر سے بے پناہ محبت ہے۔ قدرتِ الٰہی کے عناصر اور فطری مناظر کو انسانی کردار بنا کر اس طرح سے شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

مجھے سورج نے پالا ہے
چاند کی کرنوں نے نہلایا ہے
میں خود فطرت تھا، فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خون میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں
مسیں بھیگیں، رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چمن آیا
ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا

علی سردار جعفری کی نظم کا یہ بچہ بچپن سے لڑکپن کی وادیوں میں قدم

رکھتا ہے چڑیوں، تتلیوں، جگنوؤں، پھولوں، درختوں، پہاڑوں، آبشاروں، کیڑے، مکوڑوں ہر فطری چیز سے محبت کرتا ہے اور شاید وقت کی انگلی پکڑ کر اس بچے کو لڑکپن سے جوانی کی منزل تک لے آتا ہے۔ ہر ایک انسان کے لیے جوانی کا احساس ایک انوکھا تجربہ ہوتا ہے۔ اس احساس کو اس تجربے کو سردار جعفری نے اشعار کا خوبصورت جامہ پہنایا ہے، اور بڑی روانی اور فطری طریقے سے کل کل بہتے جھرنے کی طرح پھسلتا ہوا ہمارا شاعر فردوسِ بدن تک پہنچ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اور بھی شعراء نے یہ ترکیب استعمال کی ہو، یا شاید یہ نئی ترکیب ہو اور جب علی سردار جعفری ''ہر اک شمشاد پیکر'' کہتے اور لکھتے ہیں تو ان کی حق گوئی، صدق بیانی ہر حرف میں مسکراتی ہے۔ اس میں شعر کی جمالیات بھی نظر آتی ہے اور شاعر کا حسنِ جمال بھی۔

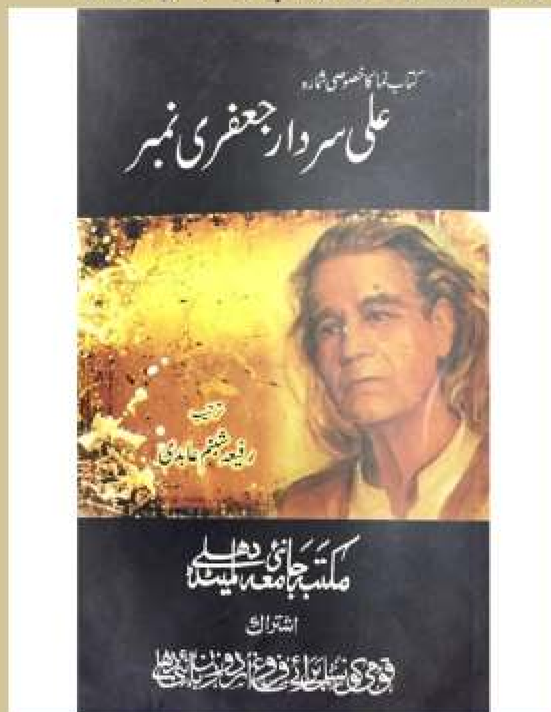

پانچواں باب ''ذکر اس پری وش کا'' یہ خالصتاً عشق کی داستان ہے اور یہ داستان عشق آزاد نظم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی غزل معلوم ہوتی ہے۔ وہی بدن کے پیچ وخم وہی بے قراری واضطراب کی کیفیت، وہی لب و رخسار کی باتیں اور وہی حسن وجمال اور فکر وصال کے جذبات واحساسات مکمل تو نہیں چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

کہاں سے آئی ہو تم
نہ گل نہ خوشبو
مگر تمہارا وجود خود روح لگتا ہے
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن گیا ہے
تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو نقطے بن رہے ہیں
وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں

عشق ومحبت کے بے لوث جذبات اور راز و نیاز انکار واقرار کی مضطرب کیفیت بیان کرنے میں علی سردار جعفری نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے:

تمہاری ''ہاں'' ایک گلاب ہے تازہ وشگفتہ
کہ جس سے ایوانِ جاں معطر
''نہیں'' یہ ننھی سی اک کلی ہے
جو دل کی نازک سی شاخ پر سو رہی ہے خواب بہار بن کر
مجھے نہیں کی کلی عطا ہو
کہ جس سے ''ہاں'' کا گلاب مہکے

نظم کا چھٹا حصہ، ''ورق ناخواندہ'' علی سردار جعفری کی علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی فتوحات کے استعاروں سے مزین ہے، وہ جہد عمل میں مسلسل سرگرم اور فعال ہیں۔ ان کے قلم سے ایک نیا جوش نیا ولولہ، عزم اور تخلیقیت کا نور افق ادب پر ضوفشانی کرتا ہے، وہ اپنے ہم عصروں کا ذکر بھی بڑے لطیف پیرائے میں کرتے ہیں اور اعضائے فطرت کو وہ ایک نئی نگاہ سے دیکھتے اور شاعر کے دماغ سے سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ نیلگوں سمندروں کو دولت، ندیوں کے صاف جھلکتے پانی کو روشنائی، فضاؤں کو سیال، ہواؤں کو ہاتھ، اور ستاروں کا نور زمین کا رقص، ایک خوبصورت امیجری کی شاعری حقیقت اور تخیل کا حسین سنگم ہر لفظ حقیقت ہے، حقیقتوں کو تخیل کا استعارہ بنا کر پیش کرنے میں انھیں فن کمال حاصل ہے۔ ساتواں باب ''صحیفۂ کائنات'' چھٹے باب کی توسیع معلوم ہوتی ہے، وہی حقیقت، وہی فکر، وہی ازل وابد اور وہی تاریخ کے اوراق مسلسل موجود ہیں۔

یہ دو ورق ہیں
زمین اور آسمان جن پر
صحیفۂ کائنات تحریر ہو رہا ہے

آٹھواں باب ''حرف بد'' میں شاعر کے اندر کا درد انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ایک چٹیلی کسک ہے، ایک شکوہ ہے۔ مطالعوں سے ہمیشہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ علی سردار جعفری جتنی زیادہ کثیر الجہات ادبی شخصیت کا نام ہے ان کے حریفوں کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ وہ اپنی قلم نوائی اور فعالیت

اور ترقی پسند فکر کی وجہ سے ہمیشہ ہی متنازعہ شخصیت رہے ہیں مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ ہر بڑی شخصیت کے حریف ہوتے ہیں اور یہی مخالفت اور تنقید ہی انھیں بڑا اور عظیم بناتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان پر بے جا تنقید بھی کی گئی اور نظریاتی اختلافات کے باعث ان پر سنگ ملامت بھی برسائے گئے مگر یہ بھی ایک اٹل حیثیت ہے کہ علی سردار جعفری اپنی روش پر قائم رہے اور اپنی صداقت کو بلند رکھا اور کبھی اپنے ناقدوں اور بدخواہوں کو خاطر میں نہیں لائے۔

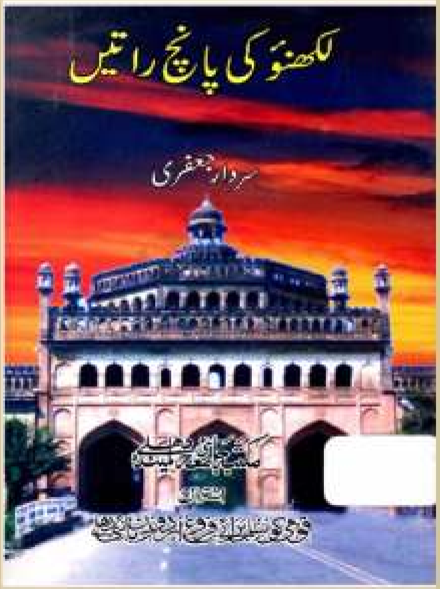

سردار جعفری اپنی کتاب ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' میں لکھتے ہیں:

''جب قلم جھوٹ بولتا ہے، یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہوگئے ہیں، میں ہر ادیب سے توقع کرتا ہوں وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔'' صفحہ ۱۱

اس طویل نظم کا آخری حصہ ''قاتل کی شکست'' بھی دراصل گذشتہ ابواب کی ہی کڑی ہے۔

اس حصے میں علی سردار جعفری حریفوں سے ہم کلام ہیں اور میدان کارزار کے جری سپاہی کی طرح للکار رہے ہیں:

اس کمیں گاہ میں کتنے ہیں کماں دار بتاؤ
تیر کتنے ہیں سیہ ترکش میں
گن کے دیکھ لو ذرا
کون سا تیر ہے مخصوص میرے دل کے لیے

اور تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہی صفت تلمیح کا استعمال کرتے ہیں اور سنگلاخ حقیقتوں کو اس طرح مصرعوں میں پیش کرتے ہیں:

ابن مریم کو کیا تم نے سرِ دار بلند
اور وہ زندہ ہیں
تشنگی تم نے محمدؐ کے نواسے کو دی
چشمۂ فیض حسینؓ ابن علیؓ جاری ہے
ابن مریم نہ حسینؓ ابن علیؓ ہوں لیکن
خون میں ہے خونِ شہادت کی حرارت پنہاں
وہ جو صدیوں سے دہکتا ہوا انگارہ ہے

نظم کے اس آخری پڑاؤ میں سید علی سردار جعفری کی سیادت اور عظمت کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی اپنی کتاب ''علی سردار جعفری ایک مطالعہ'' کے پیش گفتار میں رقمطراز ہیں:

''کوئی درخت کتنا مضبوط اور چھتنار ہے یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سواد سایہ کی پیائش کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ کتنے برگ و بار آئے ہیں۔ اس نے کتنے موسموں کو جھیلا ہے۔ اور اس کی جڑیں اپنی زمین میں کتنی گہرائی تک پیوست ہیں، سردار جعفری کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی، ایک مضبوط چھتنار درخت کے مانند بدلتے موسموں کا وار سہتی ہوئی، ہر رت میں تر و تازہ سر سبز و شاداب زندہ و تابندہ ساتھ اور پاس کے درختوں کی سازشوں سے بے نیاز، آندھیوں اور طوفانوں کی عیاریوں سے واقف ہوتے ہوئے اپنی جگہ مطمئن و مستحکم، گرد و غبار اور خس و خاشاک کی گستاخیوں پر خنداں تبسم فشاں اور ننھے چوزوں اور کیڑے مکوڑوں کی شرارتوں اور بوڑھے گھاگ حشرات الارض کی خباثتوں سے محظوظ شاداں و فرحاں، پھر بھی حافظ و غالب کی طرح سردار کی شخصیت اپنے حریفوں کے درمیان بھرپور توانائی کے ساتھ اپنا لوہا منواتی رہی''۔

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم
کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم

□□□

Dr. Kahkashan Irfan
Assitant Professor, Dept. of Urdu
Dr. Rizvi P.G. Degree College, Karari
Kushambi-212206 (U.P)

ڈاکٹر مسرت

'لیلیٰ کے خطوط' کی تانیثی قرات

بیسویں صدی کے ابتدائی عرصے میں ایک نیا رجحان ہمارے سامنے آیا۔اس نئے رجحان کا نام 'ادب لطیف' تھا۔ادب لطیف کے تحت جو تصانیف یا ادب منظر عام پر آیا اس میں اسلوب کی کارفرمائیاں نئے انداز سے پیش کی گئیں۔یہ علی گڑھ تحریک کے خلاف ایک ردعمل بھی تھا۔اس میں عورت کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کیا گیا۔اس طرز تحریر کی بدولت ہی عورت ہمارے سامنے ایک نئے روپ میں ابھری۔عورت کو موضوع بناتے ہوئے اس دور میں کچھ نئے مصنفین اور کچھ نئی تصانیف منظر عام پر آئیں۔

ادب لطیف کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، ریاض خیرآبادی کے نام شامل ہیں جبکہ دوسری نسل کے لکھنے والوں میں پریم چند، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور قاضی عبدالغفار کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ناصر علی، مہدی افادی، سجاد انصاری، پریم چند، نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے ساتھ ساتھ قاضی عبدالغفار کا نام بھی ادب لطیف کے نمائندہ لکھنے والوں کے طور پر سامنے آتا ہے۔

رومانیت سے مراد وہ احساس، جمال یا خیال کا پیرہن ہے جس میں کسی کیفیات یا احساسات کو دلکش اور دل نشیں انداز میں پیش کیا جائے اور یہ انداز قاضی عبدالغفار کے ناول 'لیلیٰ کے خطوط' میں واضح طور پر سامنے آیا ہے۔ان کے فن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے عورت کو صرف حسن و عشق تک محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے عورت کی عظمت اور اس کے وقار کی طرف پہلی بار بھرپور انداز میں اپنے ناول کے ذریعے توجہ دلائی۔'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' ان کے دو ایسے شاہکار ہیں جس میں انھوں نے کھل کر اپنے دلکش اسلوب اور انداز تحریر کے ذریعے ان دونوں تصانیف میں جان ڈال دی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے یہاں عورت کا تصور رومان ہے۔انھوں نے عورت کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ان کے نزدیک عورت دنیا کی سب سے حسین شئے ہے:

"عورت، عورت، عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اسے زینت بخش دیتی ہے۔وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے، بغیر عورت کے مرد سخت دل ہو جاتا ہے.....عورت میں حسن نہ ہوتا تو، مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی۔۔مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی اور دلبری رایگاں جاتی۔"

(شیرازۂ یلدرم، خیالستان، مکتبہ جامعہ، دہلی 1962، ص:56)

خدا کی حسین ترین مخلوق عورت ہے۔سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں، انشائیوں اور مضامین میں جس عورت کا تصور ابھرتا ہے وہ گوشت پوست والی عورت ہے اور ان کے نزدیک عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

مہدی افادی بھی ایسے ہی ادیب ہیں جن کے یہاں عورت اور حسن وعشق کے معاملات کا بیان نہایت رومانی انداز میں ہوا ہے۔مہدی افادی افسانہ نگار تو نہیں ہیں البتہ ان کے اسلوب کی جھلکیاں ان کے مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے اسلوب میں بے باکی اور بے تکلفی کا

انداز نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔مہدی افادی زبان کی چاشنی سے کچھ ایسے جملے تراشتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ الفاظ انہیں جملوں کے لیے موزوں ہوں جیسے:

''نفاست چاہتی ہے کہ دوشیزۂ کاغذی دست غیر کی مس کردہ نہ ہو---یعنی نئی نویلی ہو۔''

(مہدی افادی، آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ، افادات، ص115)

نیاز فتحپوری بھی ادب لطیف کے لکھنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ان کے موضوعات کا کینوس نہایت وسیع ہے۔وہ حسن پرست اور عاشق مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ عورت کا ذکر جس دلکش انداز سے کرتے ہیں وہ ان کے افسانوں، انشائیوں اور خطوط کی فضا کو رنگین بنا دیتا ہے۔نیاز فتحپوری کا ایک خط ان کی رومانی طبیعت اور ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

''راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پہ بندی، اب آپ سے کیا کہوں، کیا چیز ہیں۔''

(نیاز فتحپوری، والدہ مرحوم، میں اور نگار، نیاز نمبر حصہ اول، پہلا ایڈیشن پاکستانی ص:37)

ادب لطیف کا اثر نیاز فتحپوری کے ایک ایک لفظ سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔کہیں کہیں وہ اپنی تحریر کو مقصدی بھی بنا دیتے ہیں۔'ایک شاعر کا انجام' اور 'شہاب کی سرگذشت' میں انھوں نے حسن و عشق کے ساتھ ساتھ اپنے مقصد کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

'پردیسی کے خطوط' مجنوں گورکھپوری کا شاہکار ہے اور ادب لطیف کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔یہ بیک وقت شعر، ادب، تنقید، افسانہ، ناول کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔سجاد انصاری کے اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ اور سلیس الفاظ کے ذریعے اپنی تحریروں میں لطافت پیدا کر دیتے ہیں۔

ادب لطیف کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس بارے میں ڈاکٹر امیر عارفی لکھتے ہیں:

''ادب لطیف کے ابتدائی نمونے 1880 میں رسالہ ''تیرھویں صدی'' (مدیر میر ناصر علی) سے ملنے لگتے ہیں اس کے بعد عبد الحلیم شرر کے دلگداز 1888 مخزن 1901 صلائے عام (میر ناصر علی) 1908 الہلال 1912 البلاغ۔ 1913 نگار 1922 گویا ان جرائد کے ذریعہ ادب لطیف تقریباً 45 سال تک چھایا ہوا رہا اور اس کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوا اور لوگ پھر سادہ اور سلیس نثر کی طرف متوجہ ہوئے ناولوں اور افسانوں کا دور بھی 1900 سے شروع ہو کر 1940 کے لگ بھگ ختم ہو جاتا ہے اس دور میں ادب لطیف کا رجحان نسبتاً کم ہو گیا تھا کیونکہ زندگی کی کڑی حقیقتوں سے انسان آنکھیں ملا رہا تھا اور سارے ملک میں آزادی کی لہر آگ کی طرح ہر شخص کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، اور ادیب تخیل کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ چکا تھا، انقلاب روس نے دنیا کو ایک نیا سبق دیا۔''

(ڈاکٹر امیر عارفی، لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا تنقیدی مطالعہ، ساقی بک ڈپو اردو بازار، دہلی 1994، ص 57-56)

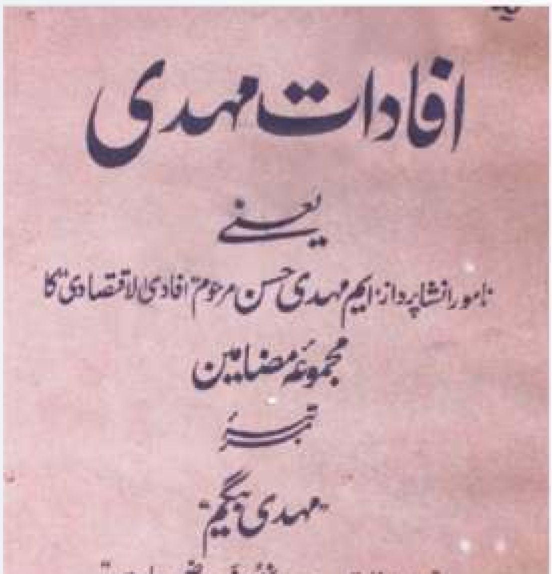

افادات مہدی

یعنی

نامور انشاپرداز ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کا

مجموعۂ مضامین

مرتبہ

مہدی بیگم

باضافۂ مقدمہ و سوانح مصنف و ضمیمہ جات

مطبوعہ مطبع حکیم برہم واقع شہر گورکھپور

اردو ادب نے جدوجہد آزادی میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔اسی دور میں کئی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔سماج کے سب سے پست طبقے یعنی طوائف کو موضوع بناتے ہوئے کئی ناول لکھے گئے مثلاً امراؤ جان ادا، ایامی، بازار حسن اور لیلیٰ کے خطوط وغیرہ۔قاضی عبد الغفار اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے مشہور و معروف ہیں۔وہ صحافی، ادیب، سوانح نگار اور انشاء پرداز تھے۔قاضی عبد الغفار کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان کے ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' روزنامچہ کو خاص مقام

حاصل ہے۔انھوں نے لیلیٰ کے خطوط میں طوائف کی زندگی کے کئی رخ ایک ساتھ پیش کیے ہیں۔قاضی صاحب نے جس انداز سے اور جن الفاظ میں سماج، تہذیب، ثقافت، مذہب اور اخلاق پر گہرے اور تیکھے طنز کیے ہیں ان کی کاٹ قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ معاشرے میں بدلاؤ لانا چاہتے تھے اور ایک ایسے معاشرے کے خواہاں تھے جہاں عورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور جہاں اس کا کردار مجروح نہ ہو۔

قاضی عبدالغفار کا سرمایہ دس کتابوں پر مشتمل ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عمدہ شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام شائع نہ ہو سکا۔ وہ کامیاب انشاء پرداز ہیں۔ان کے دو مشہور ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' ہیں۔ان کا پہلا ناول 'لیلیٰ کے خطوط' مکتوب نگاری کی ہیئت میں ہے جبکہ 'مجنوں کی ڈائری' روزنامچہ ہے۔ موضوع کے لحاظ سے دونوں ناولوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کی تصانیف کے موضوعات نئے ہیں۔ وہ متنوع موضوعات کا انتخاب زیادہ کرتے ہیں۔ عملی طور پر وہ کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے لیکن موضوع اور زبان کے لحاظ سے وہ رومانی اور ترقی پسند نثر نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

'لیلیٰ کے خطوط' پہلی بار 1932 میں شائع ہوا۔اس ناول میں لیلیٰ ایک ایسی عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے، جس کا برسوں سے استحصال ہوتا رہا ہے اور وہ خاموش تماشائی بنی ہوئی سب دکھ جھیل رہی ہے۔ وہ لوگ جو عورت کا استحصال کسی نہ کسی روپ میں کرتے ہیں قاضی عبدالغفار نے اپنے ناول کے ذریعے ان لوگوں پر گہرے طنز کیے ہیں۔ان کی نظر میں صرف سیاسی آزادی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ جب تک عورت کا استحصال کیا جاتا رہے گا سیاسی آزادی ہمارے لیے ناکافی ہوگی۔

لیلیٰ کے خطوط میں پہلا خط اس طرز میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ جیسے لیلیٰ مخاطب کو پہلے سے جانتی اور پہچانتی ہے اور وہ اس کے روبرو ہو۔ لیلیٰ کا پہلا خط ملاحظہ کیجیے جس میں وہ اپنی روداد اپنے عاشق کو کچھ یوں لکھتی ہے:

> "آپ نے صاف یوں کیوں نہ کہا کہ آپ بھی میرے حسن کے خریدار ہیں۔آپ نے شب کے دسترخوان پر میری شرکت اپنے لیے باعث مسرت بتائی ہے آپ نے کیوں نہ فرمایا کہ آپ کی منزل دسترخوان کی حدود سے باہر ہے! کیا نہیں ہے! بندہ نواز کسی دکان پر جاتا ہے تو استعارہ اور اشارہ سے قطع نظر کرکے گاہک کی طرح کھل کر سودا کیجیے۔ آپ کہیں گے کہ آپ نے اپنے خط میں آداب حجاب و حیا کو ملحوظ رکھا۔ مگر میرے لیے اس پردہ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں بقول آپ کے آج شب کو آپ کی مہمان بنوں تو مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو اسی لیے سربازار اپنا اشتہار دیتی ہوں۔" (لیلیٰ کے خطوط، ص:11)

آہستہ آہستہ لیلیٰ کی کیفیت سے قاری آگاہ ہوتا جارہا ہے کہ لیلیٰ ایک پڑھی لکھی اور باشعور عورت ہے۔اس کو طوائف بننے پر حالات مجبور کرتے ہیں۔ ناول میں لیلیٰ کو ہی عاشق کے بہت سے سوالوں کا جواب خود دینا پڑتا ہے اور قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عاشق کے سوال کا جواب ایک طوائف اتنی شائستگی سے کیسے دے رہی ہے۔ عاشق کے سوال اور اس کے جواب ایک خط میں ملاحظہ کیجیے:

> "کیا کیا احمقانہ سوالات کیا کرتے ہو۔ کبھی کہتے ہو "لیلیٰ تم خفا ہو گئیں۔" "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں۔" "کیا میری محبت کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔" "تم اتنی سنگ دل ہو۔" "تم اس قدر بے پرواہ ہو، تم اس قدر بے حس ہو۔ تمہارے ساز کے کسی تار میں آواز نہیں۔ تم ایک تودۂ برف ہو، تم ایک بھاری پتھر ہو، تم ایک بے جان تصویر ہو، تم ایک دریا ہو جس کا پانی منجمد ہے اور متحرک نہیں ہو سکتا۔ تم ایسی کیوں ہو؟ پھر تمہیں میری موجودہ زندگی یاد آتی ہے اور تم میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر بار بار مجھ سے کہتے ہو۔ کیا تم اپنے ہر دوست کے ساتھ ایسی ہی ہو؟ (لیلیٰ کے خطوط، ص:16)

قاضی عبدالغفار عورت کے اس حسن کے پرستار نظر آتے ہیں جو حسن ایک دیوی کا درجہ رکھتا ہو، جس میں پاکیزگی کا عنصر موجود ہو۔ عورت خود گناہ کو ترجیح نہیں دیتی بلکہ اس کو معاشرے میں اتنی ذلت سہنی پڑتی ہے کہ وہ گناہ کی مرتکب ہوتی ہے۔

چونکہ خطوط نگاری ایک بیانیہ صنف ہے۔اس میں لکھنے والے کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کا انتخاب کس طرح کرے۔اس کو یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی خطابت کو خطوط میں پوری طرح واضح کر دے۔ لیلیٰ کی زبان سے قاضی عبدالغفار نے جو کچھ بھی کہلوایا ہے اس میں طنز کی کاٹ گہرے طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔لیلیٰ کے ملے جلے جذبات ہیں جن میں محبت بھی ہے، انتقام بھی ہے، نفرت بھی ہے اور وفا بھی موجود ہے۔ قاضی صاحب نے ہر خط کو لکھنے سے پہلے اس میں تمہیدی انداز اختیار کیا ہے۔لیلیٰ کے ذریعے انھوں نے مرد کی فطرت کو بھی آشکارا کیا ہے۔ اپنی

تسکین کو عشق کا نام دے کر کس طرح آدمی اپنے نفس کی خواہش کو پوری کرتا ہے اس کا بڑا ہی بے باکانہ اظہار لیلیٰ کے خطوط میں ہوا ہے۔

پروفیسر امیر عارفی نے لیلیٰ کے خطوط کا تجزیہ کرتے ہوئے لیلیٰ کے بارے میں جو رائے پیش کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

''طوائف شجرِ ممنوعہ ہے، سماج کا ناسور ہے، مخرب اخلاق ہے مذہب اور تہذیب کی توہین ہے، لیکن اس کے چاہنے والے سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد رات کی تاریکی میں کوٹھے کو رونق بخشتے ہیں اور دن میں منبر و محراب سے اس کے گناہوں کی سزا، سنگ سار کا حکم دیتے ہیں۔''

(ڈاکٹر امیر عارفی، لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا تنقیدی مطالعہ، ساقی بک ڈپو اردو بازار، دہلی 1994، ص57-56)

لیلیٰ کے خریداروں میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ لیلیٰ کی زبان سے فلسفہ تو بہت بیان ہوا ہے لیکن وہ طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتا بھرا دل بھی رکھتی ہے۔ جس میں اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور زندگی کے تئیں اس کا کیا ردعمل ہے یہ سبھی باتیں اس کے لہجے سے ظاہر ہوتی ہیں۔

قاضی صاحب نے خواب اور حقیقت کے بیچ کیا رشتہ ہوتا ہے اس کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ جس کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ ان کو الفاظ کے ذریعے تصویر بنانے کا ہنر معلوم ہے۔ آہستہ آہستہ لیلیٰ اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ یہ تبدیلی احساس کے جاگنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک مثال دیکھئے:

''تم کہوگے میرا اتار چڑھاؤ بھی عجیب ہے، کبھی بجلی بن کر چمکتی ہوں، کبھی بادل بن کر گرجتی ہوں، کبھی برستی ہوں تو برسے جاتی ہوں! کبھی آندھی کی طرح اٹھتی ہوں تو چڑھے جاتی ہوں، کبھی پھول کی طرح مسکراتی ہوں اور کبھی شبنم کی طرح آنسو بن جاتی ہوں!۔ (لیلیٰ کے خطوط، ص133)

قاضی عبدالغفار کو انسانی جذبات کی عکاسی کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ لیلیٰ دنیا کے لیے شب گزارنے کی ایک جگہ ہے جہاں ہر وہ شخص حاضری دیتا ہے جو اس کا طلب گار ہوتا ہے۔ لیلیٰ کی روح تو اس کی اس عاشق کے پاس ہوتی ہے، جس کو کہ وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ خط میں اپنی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ جب لیلیٰ کھلے طور پر جذبات کا اظہار کرتی ہے تو یہ اظہار صداقت میں بدل جاتا ہے جو قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا:

''رات کو جب میرا خریدار اپنے نفس کے تقاضوں سے فارغ ہو کر سو جاتا ہے۔ میری آنکھیں اس وقت کمرے کی تاریکی میں روشنی کے ایک ذرا سے نقطے کو تلاش کرتی ہیں۔ میرے کان جوانی کے کسی بھولے ہوئے نغمہ کا انتظار کرتے ہیں! کبھی زندگی ڈھونڈھتی ہوں، کبھی موت! اس سانس گھونٹنے والی خاموشی اور تاریکی میں صرف ایک گھڑی کی آواز میرے بستر کے سامنے طاق پر سے آتی ہے: ختم۔ ختم۔ ختم: جوانی ختم!۔ عیش جوانی ختم!! امیدیں ختم! زندگی ختم! سب ختم، سب ختم! محبت کی آواز جو ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ اور وہ مسرت جاوداں جو عورت کی روح میں اپنا گھر بناتی ہے۔۔۔ سب ختم!''۔

(لیلیٰ کے خطوط، ص143)

لیلیٰ محبت کی طلب رکھتی ہے۔ وہ محبت کو جنس سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ وہ مردوں کی مکاری کو ان کے نفس کی خرابی قرار دیتی ہے۔ قاضی عبدالغفار قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔ انھوں نے معاشرے کے ذریعے عورتوں پر ہو رہے بیجا ظلم کی شدید مذمت کی ہے۔

قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط کے ذریعے سیاسی، سماجی،

معاشی اور مذہبی مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ان کی تحریروں میں گہرا طنز موجود ہے۔لیلیٰ کی زندگی میں آنے والا ہر لمحہ اذیت ناک اور درد انگیز ہے۔ یہ صرف لیلیٰ کی زندگی نہیں ہے ہمارے معاشرے کی وہ صورت حال ہے جو کسی نہ کسی مشکل میں آج بھی معاشرے میں موجود ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے معاشرے میں عورت کی جو صورتحال ہے وہ حیران کر دینے والی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنے اس ناول کے ذریعے معاشرے میں عورت کی استحصالی صورت کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ چاہے جتنی ترقی کر لے، عورت کو آج بھی دوسرا مقام دیا جاتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے اپنے اس ناول میں انشاء پردازی کا اچھا نمونہ فراہم کیا ہے۔ان خطوط میں سادگی بھی ہے، مبالغہ آرائی بھی ہے، بذلہ سنجی، شوخی اور ظرافت بھی موجود ہے۔اس ظرافت میں دکھ کی پکار بھی ہے۔لیلیٰ کی شوخیوں میں اس کا درد پوشیدہ ہے۔لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ فکر انگیز اور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔اس کی زندگی میں پیش آنے والا ہر واقعہ ایک نئے درد کی داستان معلوم ہوتا ہے۔بظاہر تو یہ ناول ایک مرد کے ذریعے ہی لکھا گیا ہے لیکن ناول کے طرز تحریر سے عورت کے جذبات و احساسات کا اظہار بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

'لیلیٰ کے خطوط' قاضی عبدالغفار کا شاہکار ناول ہے جس میں ایک طوائف کے شب و روز کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ان خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لیلیٰ ایک مہذب اور شریف خاندان کی ایک ایسی لڑکی تھی جسے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا سے کیا بن جانا پڑا۔

بظاہر طوائف کا کردار اردو ناول میں نیا اور اچھوتا نہیں ہے لیکن قاضی عبدالغفار نے اپنے لہجے کی تلخی اور انداز بیان کی بدولت اس میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے ہر خط میں فلسفہ موجود ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ سے ہی سوال کرنے لگتی ہے اور کبھی معاشرے کی سفا کی پر گہرے طنز بھی کرتی نظر آتی ہے۔

لیلیٰ ایک طوائف کی داستان ہے لیکن قاضی عبدالغفار نے اپنے اس ناول کے ذریعے عورت کے دبے کچلے جذبات و احساسات اور اس کی بے چارگیوں کا ذکر جس بے باکی اور طنزیہ لب و لہجے میں کیا ہے وہ ان کی جرأت مندی کی اہم دلیل ہے۔لیلیٰ ان تمام اخلاقی قدروں کا قلع قمع کر دینا چاہتی ہے جس پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ وہ ایسے نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتی ہے جہاں سارا اقتدار صرف مردوں کے حصے میں آیا ہو۔لیلیٰ ایک ایسے نظام کی تشکیل میں یقین رکھتی ہے جہاں صرف عورت کو عورت ہونے کی سزا نہ دی جائے بلکہ اس کے وجود کو بھی تسلیم کیا جائے۔ وہ اپنے وجود کی متلاشی نظر آتی ہے۔اسے ایسے معاشرے سے سخت نفرت ہے جہاں عورت کا وجود مرد کے لیے محکومیت کا درجہ رکھتا ہو۔اسے مرد کی داشتہ بن کر زندہ رہنا ہرگز گوارہ نہیں۔اپنے ان خیالات کی ترجمانی لیلیٰ کچھ یوں کرتی ہوئی نظر آتی ہے:

> ''کیا وہ دن کبھی نہ آئے گا کہ عورتیں تمہاری ہوس بھری آنکھوں میں سلائی پھیر کر تم کو اندھا کر دیں تاکہ تمہاری بے شرم آنکھ ان کے حسن کو دیکھ ہی نہ سکے! تمہارے کانوں میں گرم تیل ڈال کر تم کو بہرہ کر دیں تاکہ وہ پھر کسی عورت کی موسیقی سے آشنا نہ ہوں! تمہارے جسموں کو آگ اور دھوپ میں اس طرح خشک کر دیں کہ تمہاری ہڈیوں میں بھی نم باقی نہ رہے۔'' (لیلیٰ کے خطوط، ص:77)

لیلیٰ کو اس بات پر پورا یقین ہے کہ آنے والا وقت عورت کی مکمل آزادی اور اس کے وجود کا متلاشی ضرور ہوگا۔ زمانہ ایک نئی صبح سے دوچار ہوگا جس میں مردوں کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ عورت جن حقوق کی منتظر ہے وہ عنقریب اس کو مل کر رہیں گے۔

قاضی عبدالغفار نے ان خطوط کے ذریعے اس عہد کے سماج، مذہب کے غلط استعمال، سیاسی حالات اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔اس عہد میں عورت کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر کے رکھنے کا رواج ہوگا تبھی تو انھوں نے اسی ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان تمام زخموں پر مرہم رکھنے کا کام کیا جس کو معاشرے نے چھپا رکھا تھا۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں طوائف کی زندگی کا تجزیہ جس بے باکانہ انداز میں کیا گیا ہے وہ مرد اس معاشرے کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ عورت کے ساتھ انھوں نے جو سلوک کیا ہے وہ کس حد تک صحیح اور جائز ہے۔ان ناول میں عورتوں کی زندگی کو بنیاد بناتے ہوئے ان کی زندگی کے پیچیدہ اور سنجیدہ مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور جس لب و لہجے اور تلخ حقیقت نگاری کا سہارا لیا گیا ہے وہ ایک بے مثال کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اس معنوں میں بھی اہمیت کا حامل ہے کہ قاضی عبدالغفار نے عورت کے استحصال اور مردوں کے تئیں ان کی سوچ کو بڑی تلخی، بے باکی اور حقیقت پسندانہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے جو ان کی جرأت مندی کی اہم دلیل ہے۔

□□□

musarrat.parveen5@gmail.com

بچوں کی تعلیمی نشوونما اور والدین کی ذمہ داریاں

ڈاکٹر محمد طالب اطہر انصاری

ماں کی گود طالب علم کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور بچپن نشوونما کا ایک اہم مرحلہ تسلیم کیا جاتا ہے، یہ مرحلہ ہی طالب علم کی مکمل نشوونما کی بنیاد ہے اور بچپن کے بعد کی تمام تر نشوونما اس بنیادی عمل پر ہی منحصر کرتی ہے۔ اس وقت ذہنی، جسمانی، شعوری، سماجی، جذباتی نشوونما اور بالیدگی تیزی سے ہوتی ہے، طالب علم کی یہ تمام صلاحیتیں ایک خاندان میں ہی رہ کر پروان چڑھتی ہیں، جس میں پیار، محبت، شفقت کے ساتھ ساتھ جسمانی غذا، ماں کی گود میں سلامتی کا احساس، یقین اور صحت مندانہ ماحول شامل رہتے ہیں، جو آخری وقت تک کامیابی اور صحت کی عکاسی کرتے رہتے ہیں۔ والدین کا آپسی پیار و محبت یا نفرت کا ماحول طلبا کے اوپر مثبت یا منفی اثر ڈالتا ہے اور طلبا کی مختلف صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاندانی ماحول طالب علم کی نشوونما میں اہم رول ادا کرتا ہے اگرچہ اسکول بھی ایک محدود دائرہ میں رہ کر کام کرتا ہے اور ان مسئلوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو والدین کی لاپرواہی سے پیدا ہوتے ہیں مگر اسکولوں میں ایک حد تک ہی طالب علم کی نشوونما کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اسکول بھی طلبا کی مثبت نشوونما کے لیے طالب علم کے گھر کے ماحول کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر والدین اپنے بچوں کے لیے فکر مند ہوں بچوں کا ترقیاتی تصور رکھتے ہوں تو طالب علم کے سامنے آنے والی بہت سی دشواریوں سے بچا سکتے ہیں اگر یہ مسائل اس عمر میں حل نہیں کیے جاتے تو آگے چل کر اور مضبوطی کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

خاندان کی کشیدگی، والدین کے اختلافات، جذباتی خرابی، دباؤ وغیرہ سے طلبا اپنی تحصیلی کامیابی میں کمزور ہو سکتے ہیں۔ ان کی عادتیں اور روایات خراب ہو سکتی ہیں، بچپن میں ہی افسردگی آ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری پریشانیاں ان کی زندگی کے راستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔

والدین اپنے بچوں کو سمجھیں

والدین کو اپنے بچے کی مختلف ضروریات پر توجہ دینا لازمی ہے۔ بچے بھی ذہنی، جسمانی، جذباتی، اخلاقی اور دانشورانہ ضرورتیں اور مطالبات رکھتے ہیں، یہ سبھی ان کے لیے ضروری ہیں، کسی ایک ضرورت پر زیادہ توجہ مرکوز کرنا نہ صرف نشوونما میں توازن خراب کرے گا بلکہ اس سے دوسرے پہلو کی نشوونما پر بھی برا اثر پڑے گا۔ کچھ والدین طالب علم کی جسمانی نشوونما، کچھ والدین اخلاقی نشوونما اور کچھ دانشورانہ صلاحیتوں کو فوقیت دیتے ہیں جس سے طالب علم کی دوسری اہم ضرورتیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ والدین کو کیا کرنا چاہیے کہ طالب علم کی نشوونما کی تمام ضرورتیں اور مطالبات پورے ہو سکیں۔

(1) جسمانی ضرورتیں (Physical Needs):

طلبا کی جسمانی ضرورتوں میں والدین کو پر سکون نیند، صحت مند غذا، جسمانی ورزش، کھیل وغیرہ کا اہتمام کرنا ہوتا ہے، کبھی کبھی والدین

لاعلمی، غلط فہمی اور بہت زیادہ پیار محبت کی وجہ سے اس جسمانی ضرورت پر پوری توجہ مرکوز نہیں کر پاتے۔ کم کھانے، کم کھیلنے اور کم آرام کرنے کی عادتوں سے جسمانی نشو ونما دیر سے ہوگی اور صحت سے تعلق رکھتے ہوئے مسائل طلبا پر غالب آجائیں گے، ان بے ضابطگیوں سے طالب علم کے اندر روز مرہ کی زندگی میں نااہلی اور غیر ذمہ دارانہ روایات شامل ہوجائے گی۔ طالب علم سے ہر کام تیزی سے پورا کرنے کی توقع کی جاتی ہے مگر اس سے طالب علم کے اندر غیر سلامتی، خود اعتمادی کی کمی، غصہ اور چڑچڑا پن پیدا ہوگا۔ اس لیے طالب علم کی جسمانی ضرورتوں کو سمجھنا ضروری ہے، خاص طور پر بچپن اور نوبلوغیت کی عمر میں، تاکہ ہم ان ضرورتوں کو مناسب طریقہ سے پورا کرسکیں یا ان میں مثبت بدلاؤ لاسکیں۔

(2) دانشورانہ ضرورتیں

چھوٹے بچوں کی دانشورانہ صلاحیتیں اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے اور اس میں مختلف طریقے سے حصہ لینے سے پیدا ہوتی ہیں جس سے وہ کچھ لفظ اور رائج زبان سیکھتے ہیں اور والدین سے زبان کو مشق کرنے کی ترغیب حاصل کرتے ہیں۔ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے اندر اعلیٰ درجے کا دانشورانہ تجسس اور دریافت کرنے کا شوق پروان چڑھتا ہے جس کو یہ طلبا نہ صرف اسکولی مضامین سے بلکہ دوسری مختلف کتابوں اور میگزین رسالوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ اسکولی ماحول، دوستوں کے ساتھ تبادلۂ خیال اور اساتذہ کی رہنمائی سے حاصل کرتے ہیں۔ والدین کو اپنے طلباء کو ارد گرد کے ماحول، معاشرے اور دنیا کو جاننے سمجھنے سے نہیں روکنا چاہیے، تاہم طالب علم کو مختلف کارکردگیوں جیسے کتابوں کا مطالعہ، تعلیمی دورے، دلچسپ واقعات، مختلف تقریبوں اور معاشرے کے معزز لوگوں کی صحبت کے مواقع فراہم کرنے چاہیے۔ جب ان کاموں میں طلبا کی دلچسپی قائم ہوگی اور ان کو مواقع حاصل ہوں گے تو ان کو ایسی صلاحیتیں ظاہر کرنے کا موقع بھی حاصل ہوگا جس سے وہ حوصلہ افزا ہوسکیں گے۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ اگر طالب علم کوئی دیگر کام کر رہا ہے تو اسے نہ روکیں اور اس کی دل شکنی نہ کریں۔ بچے اس وقت مختلف حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جب وہ کسی کارکردگی میں فضیلت حاصل کرلیتے ہیں تو انھیں خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے والدین کو اپنے بچے کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنی چاہیے جس سے وہ ماحول کو سمجھ سکیں اس سے ہم آہنگ ہوسکیں اور ترسیلی مہارتیں حاصل کرسکیں۔ ان سے طلبا کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی دانشورانہ صلاحیتوں کی نشو نما بھی تیزی سے ہوگی۔

اگر بچہ کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو اس کی فطری تخلیقی صلاحیت ختم ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے والدین پر غصہ کرنے لگتا ہے۔ مختلف تحقیقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو بچے اپنے والدین سے اچھے تعلقات قائم رکھتے ہیں وہ دانشورانہ صلاحیتوں میں اچھے ہوتے ہیں۔

(3) بچوں کی سماجی وجذباتی ضرورتیں اور مطالبات

بچوں کی سماجی وجذباتی ضرورتوں اور مطالبات کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے، ان کی ضرورتوں اور مطالبات کو والدین اگر سمجھیں، ان کی حوصلہ افزائی کریں اور جسمانی وجذباتی طریقہ سے ان کے قریب رہنا نہیں بھولیں تو بچہ خاص کر چھوٹے بچے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ چھوٹے بچے اپنے والدین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہیں، وہ جب بھی خوف زدہ، کشیدگی یا کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے والدین کی طرف مدد حاصل کرنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ والدین کو ان کی مدد سماجی، جذباتی اور جسمانی طور پر کرنی چاہیے، مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ والدین بچے کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس ضرورت کی طرف تب ہی توجہ دیتے ہیں جب وہ چڑچڑا ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ علامتیں ظاہر کرتی ہیں کہ بچے کی نشو ونما صحیح اور مناسب طریقے سے نہیں ہو پا رہی ہے۔

والدین کو حالات کو قابو سے باہر ہونے سے پہلے ہی اپنی توجہ بچے کی طرف مرکوز کرنی چاہیے اور بچے کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ اس کے والدین اس کی حمایت میں کھڑے ہیں۔ اگر بچے کی عادت جارحانہ ہوں تو اس کو فوراً سمجھنا ہوگا، کبھی کبھی والدین اپنی مصروفیت کی وجہ سے بچے کو اکیلے چھوڑ دیتے ہیں اور توجہ نہیں دیتے ایسے بچے کبھی کبھی سنجیدہ امراض میں مبتلا ہوسکتے ہیں جو بچے پانچ سے چھ سال کے ہوتے ہیں وہ اگر جذباتی طور پر صحت مند ہوں تو وہ اس قابل ہوسکتے ہیں کہ والدین سے کچھ وقت کے لیے دور رہ سکیں مگر زیادہ چھوٹے بچے اپنے والدین کے قریب ہی رہنا پسند کریں گے۔ اگر کوئی بچہ گھر سے اسکول میں صحیح طریقہ سے منتقل نہیں کر پاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی بات سے خوف زدہ ہے جو اس کے گھر کے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں اور بچہ اپنے والدین کا ساتھ چاہتا ہے۔ بچے کی ضرورتیں اپنے خاندان سے نکل کر دوستوں، سماج اور معاشرے کے مختلف دائروں تک پھیلانے کی ہوتی ہیں، دوستوں کے ساتھ بچوں کے تعلق بہت اہم ہوتے ہیں۔

والدین اور بچوں کے تعلقات

بچہ اور والدین کے درمیان تعلقات والدین کے تصورات پر مبنی

ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح بچوں کی سماجی ضروریات، مطالبات اور نظم وضبط کو مناسب طریقہ سے فراہم کرسکیں گے۔ والدین جانتے ہیں کہ بچوں کی رہنمائی میں کب سزا اور انعام دیا جائے جس سے وہ دلچسپی کے ساتھ صحیح راستہ اختیار کرسکیں اس سے کبھی کبھی منفی نتائج بھی ہاتھ لگ سکتے ہیں اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی رہنمائی کرنے میں جو طریقہ استعمال کریں اس طریقہ کے بارے میں پوری جانکاری اور مہارت حاصل کریں۔ کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ والدین کا رخ طلبا کے لیے واضح نہیں ہوتا اور بہت سے والدین ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں پر غالب آجائیں ایسے والدین کو ہم مختلف طریقہ سے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(1) حکمراں والدین (Authoritarian Parents)

حکمراں والدین آمرانہ نظریہ رکھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم بچے کے لیے جو کر رہے ہیں وہ اس کے لیے سب سے اچھا ہے اور بچے صرف ہمارے حکم کی پابندی کرے، وہ بچے کی پوری زندگی کے اوپر اپنا حق سمجھتے ہیں اور بچے کی ہر کارکردگی جیسے پڑھنے لکھنے، کھیلنے کودنے اور بچے کے ذاتی معمول میں مداخلت کرتے رہتے ہیں، ہر کام کو منع کرتے ہیں یا پھر بہت کم وقت مہیا کرواتے ہیں اور والدین یہ بھی طے کرتے ہیں کہ بچے کیا پہنیں، کیا کھائیں اور کن دوستوں کے ساتھ صحبت اختیار کرے۔ وہ بچے سے کبھی صلاح یا مشورہ حاصل نہیں کرتے، جب کبھی وہ بچے سے رائے لیتے ہیں تو اس کی دلچسپی جاننے کے لیے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لیے رائے لیتے ہیں کہ کہیں بچے سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی ہے۔

(2) جمہوری نظریہ کے والدین (Democratic Parent)

بہت سے جمہوری نظریہ کے والدین اس نظریہ کے مطابق اپنے بچوں کو کامیابی دلاتے ہیں۔ یہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ فیصلہ سازی میں، بات چیت و مذاکرات کرنے میں اور تبادلہ خیال کرنے میں اور بچے کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ تاہم والدین کو اپنے بچے کے ساتھ بات چیت، تبادلۂ خیالات و مذاکرات کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیے، وہ اپنے بچے کی طاقتور صلاحیتوں کو سمجھنے میں مدد کریں اور بچے کو کسی پیشہ کی طرف رجحان پیدا کر اس کو حاصل کرنے کی رہنمائی کریں۔ مگر اس وقت حالات بہت خراب ہوجاتے ہیں جب تبادلۂ خیال کے دوران بچے یا والدین اپنا صبر وتحمل کھودیتے ہیں، اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہ ضد ہوجاتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں۔ جمہوری نظریہ کے والدین، بہت صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کردیتے ہیں مگر وہ سنجیدہ مسئلوں میں اپنے رخ پر سنجیدگی سے قائم رہتے ہیں۔

(3) اجازت لینے والے والدین (Permissive Parents)

بہت سے ماں باپ سوچتے ہیں کہ بچہ تب، بہت تیزی سے اپنی نشو ونما کرے گا جب آپ بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور کم سے کم مداخلت کریں۔ اس طرح کے والدین اپنی کوئی بات بچوں پر نہیں تھوپتے، اس کے راستہ میں کبھی نہیں آتے اور نہ ہی اس کی رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں بس اس کے جائز وناجائز مطالبات پورے کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے کردار وہ لوگ نبھاتے ہیں جن کے پاس وقت کی کمی ہے یا پھر وہ ذاتی اہلیت نہ رکھتے ہوں اور بچے کو ماہر سمجھتے ہوں، ان وجوہات سے بچے لاپرواہی کا شکار ہوجاتے ہیں چونکہ والدین اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور وہ صرف بچوں کی ضرورتیں پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور یہ ضرورتیں پوری کرتے ہی رہتے ہیں۔ ان حالات میں چاہے ضرورت پوری ہو یا نہیں بچے ضرورت سے زیادہ آزادی حاصل کرلیتے ہیں اور نئے نئے مطالبات کرتے رہتے ہیں، اس سے بچے معقول اور نامعقول چیزوں، عادات وروایات اور تعلقات کے بارے میں نہیں سمجھ پاتے اور نہ ہی سیکھ پاتے ہیں۔ اس طرح کے بچے سماجی مہارتوں، سماجی اقدار کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے، خاندانی رشتے اور سماج کے قاعدے قانون جو عام طور پر والدین سکھاتے ہیں ان بچوں میں نہیں پائے جاتے اور یہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ ان بچوں میں سماجی مہارتوں کی کمی اور ان کے رویے کی وجہ سے ان کے سماجی تعلقات اچھے اور صحت مند نہیں بن پاتے۔ یہ بچے ہمیشہ اپنے آپ کو اچھا اور دوسروں کو غلط تصور کرتے ہیں اور تعلیمی لیاقتیں حاصل نہیں کرپاتے اور یہ تصور ان بچوں کے اندر پختہ ہوجاتا ہے کہ ان کے والدین ان کی تمام ضرورتیں تاعمر پوری کرتے رہیں گے۔

والدین اپنے عادات واطوار کا احاطہ کریں

والدین کی ازدواجی زندگی کے رشتے اور خاندانی ماحول

ایک مثبت خاندانی ماحول کی خصوصیت ہے کہ وہ اہل خانہ کے تمام افراد میں گرم جوشی، پیار ومحبت، یقین اور تعاون قائم رکھتا ہے۔ یہ خاندان کے مختلف لوگوں کو ان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوئے صرف وسائل فراہم کرنے، تعلیمی لیاقت حاصل کرنے پر ہی منحصر نہیں ہوتا بلکہ خاندان کے تمام لوگوں کے ساتھ وقت صرف کرنے پر منحصر ہے یہ کام ایک خاندان کے لوگوں میں صبر وتحمل پیدا کرتا ہے جو وہ اپنی وراثت سے حاصل کرتے ہیں، جس کا جز و خوشگوار ماحول ہوتا ہے اور یہ خوشگوار ماحول ہی ان لوگوں کے والدین

بننے کی ذمہ داری میں ایک کردار کے طور پر نظر آتا ہے۔ یہ بھی پہلو خاندان کے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاہم خاندان کے سبھی فرد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور سب سے پہلے وہ خاندان کے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاندان میں خوشگوار ماحول قائم کرنے کا عمل والدین کے آپسی ازدواجی زندگی کے تعلقات، والدین کے گھر کے بچوں کے ساتھ تعلقات سے شروع ہوتا ہے۔ معیاری خاندانی زندگی میں مثبت تعلقات، پیار و محبت، عزت اور آپسی مواصلات شامل رہتے ہیں۔ کشیدگی میں مبتلا رہنا، غصہ، غلط بحث، چڑچڑے والدین بچہ کی نہ تو حوصلہ افزائی ہی کر سکتے ہیں اور نہ ہی بچوں کو تحفظ اور خود اعتمادی حاصل کروا سکتے ہیں۔ والدین کو آپس میں بے کار بحث نہیں کرنی چاہیے اور والدین کو ایک دوسرے کو مثبت خاندانی ماحول تعمیر کرنے کے لیے نصیحتیں اور ایک دوسرے پر تہمت نہیں لگانی چاہیے۔ ایک باشعور والدین درجہ ذیل طریقہ سے اپنی زندگی شروع کرتے ہیں جس سے بچوں کو ایک مثبت ماحول فراہم کیا جاسکے:۔

☆اول:۔ سب سے پہلے اپنے ترسیلی طریقہ اور نوعیت کو پہچانیں اور اگر ضرورت ہو تو اپنے آپ کو درست کریں۔ آپ ایسی ترسیل کیجیے کہ اس میں تنقید کی جگہ ہی نہ رہے اس کردار کو اپنائیے جو آپ اپنے رول ماڈل میں دیکھنا چاہتے ہیں، یاد رکھیں اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ اگر ہو سکے تو اپنی خود کی تنقید سے ان کمیوں کو دور کر اپنی حوصلہ افزائی خود کریں۔ خاندان کے ماحول کو صحت مند بنانے کے لیے آپ کو اپنی شریک حیات اور شریک حیات کو آپ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے ہوں گے۔

☆بچوں کے ہر مسئلے کی وجہ اور بنیاد تلاش کریں اور اس مسئلے سے تعلق رکھتے ہوئے سبھی پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے سبھی لوگوں سے بات چیت کریں۔ بچوں کے استاد سے تبادلۂ خیال کریں، بچوں کا معمول دیکھیں اور ان کے معمول میں مثبت تبدیلی لانے کی کوشش کریں۔

☆بچوں کی ہر وقت تنقید نہ کریں، بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ بچوں کی آمادگی اور حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کریں۔

☆اگر ضرورت ہو تو اپنا معمول بھی دیکھیں، بچوں کے ساتھ وقت صرف کریں جب وہ مطالعہ کر رہا ہو تو جسمانی اور جذباتی طور پر اس کے ساتھ شامل ہوں۔

☆بچے کی دلچسپی کو تلاش کریں، بنا تنقید کیے بچے کی سوچ کے ساتھ شامل ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں۔

☆بچے کے دوستوں اور ساتھیوں کو پرکھیں اور ان دوستوں کے کارناموں کے بارے میں بچے سے بات کریں مگر ان دوستوں کے اوپر تنقید نہ کریں۔

☆اگر کسی مسئلے پر بچے قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں، ضد کرتے ہیں تو اس پر تبادلۂ خیال کرنا بند کر دیں چونکہ نوجوان بچے چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی اس مسئلہ پر زیادہ بات کرنے سے بھڑکے گا ہی۔

☆اگر بچوں کے ساتھ مسئلوں کا حل خاندان میں نہ نکل رہا ہو تو کسی معزز بزرگ سے یا پھر کسی پیشہ ور مشیر سے بات کریں۔

نوجوان بچوں کے مسئلوں میں بچوں کی جذباتی افراتفری، غصہ، آوارہ گردی، جنس سے تعلق رکھتی ہوئی ضرورتیں، سماجی روایات، ان کے جسم اور پیشہ سے تعلق رکھتے ہوئے شک و شبہات اور تشویش کو شامل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک ان باتوں پر والدین اور بچوں کے بیچ تنازعہ بنا رہتا ہے اگر تھوڑے سے صبر و تحمل سے بات کی جائے تو سبھی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مگر ایسے مسائل اکثر بڑھ جاتے ہیں چونکہ والدین کو اپنے بچے کے بارے میں بے چینی اور خوف بنا رہتا ہے کہ وہ اس نوجوانی کی عمر میں کوئی غلط کام یا قدم نہ اٹھالے۔ اس لیے پہلا قدم تسلی رکھنا ہے اور زیادہ بے چین نہیں ہونا ہے۔

والدین بچوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ترقی کی سہولتیں فراہم کریں

بچے اپنے آس پاس کے ماحول اور چیزوں کو تلاش کرنے، مختلف صلاحیتوں کو اپنانے اور سیکھنے کے لیے فطری طور پر حوصلہ افزاں ہوتے ہیں۔ تاہم جب خاندان کے بڑے اور معزز بزرگ یا والدین ان کو ہر کام میں روک ٹوک، سخت روایات اختیار کرتے ہیں اور یہ کام کرو، یہ مت کرو وغیرہ سے بچوں میں فطری سیکھنے کے عمل کی خوشی کم ہو جاتی ہے۔ جب والدین بچے کو سیکھنے میں اپنے طریقہ اور اپنی رفتار تھوپنا چاہتے ہیں تو بچے کشیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی دلچسپی کم ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم ریاضی میں اچھی کارکردگی پیش نہیں کر رہا ہے مگر وہ لگاتار اس پر وقت صرف کر رہا ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کو بنا کسی مدد کے سدھار لے جس سے اس کا ڈر اس مضمون سے دور ہو جائے۔ مگر والدین بھی اسے بار بار پریشان کر رہے ہیں اور تنقید کرتے ہیں کہ صرف ریاضی ہی پڑھتے رہتے ہو باقی مضامین کا کیا ہوگا؟ تو طالب علم اپنی کمزوریوں، کم تعلیمی کامیابیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے کشیدگی میں آجائے گا۔

اگر والدین کے رویے کی وجہ سے بچے میں کشیدگی آتی ہے تو وہ حوصلہ افزاں نہیں ہو سکتا۔ نشوونما اور ترقی تب ہوتی ہے جب بچہ حوصلہ افزائی کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے۔ بچے کو حوصلہ فراہم کر کے ہم تعلیم، پیشہ،

سماجی، جذباتی و اخلاقی مہارتوں اور جسمانی و ذہنی محنت مشقت کے لیے بچے کا مثبت نظریہ قائم کر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ طلباء کی نشوونما تیزی سے اس وقت عمل میں آتی ہے جب بچے اپنے آپ کو مطمئن، محفوظ اور خوش محسوس کرے۔ کشیدگی میں مبتلا، حوصلہ شکن اور مسترد بچے ذمہ داری اور کام دونوں سے ہی منہ چراتے ہیں۔ یہ والدین کی محبت و شفقت ہی ہے کہ بچے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاہم سبھی ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، آیئے ہم غور کریں کہ والدین کو کیا کرنا چاہیے؟ اور کیا نہیں؟ جس سے بچوں کی تعلیمی، معاشرتی اور پیشہ ورانہ فلاح ہو سکے۔

(1) تعلیمی نشوونما

کسی بھی کام کو کرنے کے لیے اگر حوصلہ افزائی ہو تو اس میں کامیابی کا تجربہ حاصل ہوتا ہے، خوشی کا احساس ہوتا ہے اور جن کارکردگیوں کے لیے حوصلہ افزائی ملے تو ان کو کرنے سے اطمینان اور صلاحیتوں کے ساتھ جاری رکھنے کی تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔ بچے ان کارکردگیوں کو کرنا پسند نہیں کرتے جس میں وہ پہلے ناکام ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر ان کی نظر میں یہ کام بہت مشکل ہو اور آسانی سے پورا نہ کیا جا سکے ایسے کاموں سے بچے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، والدین کے سامنے یہ ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ان مشکل کاموں کو بچوں سے کروائیں، اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ بچوں کو حوصلہ افزائی اور تقویت فراہم کی جائے جس سے وہ کامیابی حاصل کر سکیں۔ والدین کو ان پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے اور مشکل کام کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر بچے کو کام شروع کرنے کی تلقین کی جانی چاہیے، جس سے بچے اس کام کو آسانی سے پورا کر لیں اور مطمئن ہو جائیں۔ بعد میں جب بچے ان کاموں کو کرنے میں مہارت حاصل کر لیں تو والدین ان کی خواہشات کی بنیاد پر ان کے سامنے ایک حدف مقرر کر سکتے ہیں۔

کیا ہوتا اگر افسانہ کا خیال رکھنے والی اس کی ماں اس کے پاس نہیں ہوتی۔ والدین کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بنا کسی وجہ کے وہ اپنے بچے کو تعلیمی کامیابی کے لیے نہ روکیں ٹوکیں۔ اگر وہ محسوس کریں کہ بچے کی اسکول کی کارکردگی اچھی نہیں آ رہی ہے تو اسکول کے ٹیچر سے اس موضوع پر بات کریں اور گھر کے ماحول اور اپنے موقف کے ساتھ پورے ماحول کا جائزہ لیں اور بچے کی خراب کارکردگی کی وجہ تلاش کریں اور تنقیدی زاویہ میں اپنی تشویش ظاہر کریں۔ والدین اگر بچے کی رہنمائی اور مدد کرتے ہیں تو بچوں کی نظر میں یہ پیار محبت دکھاتا ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ دخل اندازی سے بچہ سمجھتا ہے کہ وہ نا اہل اور نا قابل ہے اور اس کے والدین اس کی صلاحیتوں میں یقین نہیں رکھتے۔

ایک اور بات ان والدین کے لیے جو بچوں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے ہیں، ان والدین کو اپنے بچوں کا دوسرے بچوں سے مقابلہ اور موازنہ نہیں کرنا چاہیے چونکہ بچے ہر وقت اپنی خود کی ذات کی پیائش کا موازنہ اپنے ساتھی طلباء کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور اگر دوسرے بچے آگے نکل جاتے ہیں تو وہ کشیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اگر اس بات کو ان کے والدین بھی کہیں تو وہ اس بات کو اور پختہ کر لیں گے کہ واقعی ان کے اندر صلاحیتوں کی کمی ہے۔

اس سے ان بچوں کے اندر مایوسی، کشیدگی اور دشمنی وغیرہ پیدا ہو سکتی ہے اور بچوں کی تعلیمی کامیابیاں خراب ہو سکتی ہیں چونکہ وہ احساس کمتری، حوصلہ شکنی اور کشیدگی میں مبتلا ہیں۔ جب بھی والدین اپنے بچوں کی تعلیمی کامیابیوں میں کمی محسوس کریں تو وہ بچے کی مدد اور حوصلہ افزائی کر کے بچے کی کشیدگی کو کم کریں اور بچے کو اس کی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو بتا کر اس کی پسند کے مضامین کی طرف پیش رفت کرنے میں مدد کریں۔ کبھی کبھی نوجوان کامیابی کے لیے کوشش نہیں کرتے چونکہ ان کے سامنے کوئی حدف نہیں ہوتا۔ تمام بچوں کی شخصیت ایک سی نہیں ہوتی، کچھ بچے آٹھویں اور نویں جماعت میں ہی اپنے مضامین کو پیشہ کی نوعیت کے اعتبار سے خود ہی تلاش کر لیتے ہیں اور اس کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ جبکہ بہت سے اپنی پسند درجہ گیارہ بارہ تک بھی ظاہر نہیں کر پاتے یہ بچے عام طور پر تعلیمی کامیابیوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ والدین کو بچے کی اصل صلاحیتوں کو پہچان کر اس کی رہنمائی کرنی چاہیے اور اس کی صلاحیتوں اور پسند کے اعتبار سے مضامین کو کسی پیشہ سے ربط قائم کر اس کی طرف مائل کرنا چاہیے۔

(2) پیشہ ورانہ ترقی

بچوں کی پیشہ ورانہ ترقی کے تعلق سے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ پیش رفت یا تو اسکول یا پھر کالج کی پڑھائی ختم ہونے کے وقت کی جاتی ہے۔ مگر یہ صرف پیشہ ورانہ رفت یا پسند نہیں ہے تاہم اس میں علم، قابلیت، مہارتیں، سائنسی خیالات، درس و تدریس وغیرہ شامل رہتے ہیں جس میں مضامین اور پیشہ کے ساتھ بچہ کی دلچسپی، روایات اور رجحانات بھی شامل رہتے ہیں۔ بچے اپنی دلچسپی اور صلاحیتوں کا مظاہرہ اپنی کارکردگیوں سے ظاہر کرتے ہیں، طلبا اگر کسی مضمون میں کمزور ہوتے ہیں تو ان کی کارکردگیوں میں کوئی حصہ اور دلچسپی نہیں دکھاتے اور اپنی دلچسپی کو غیر واضح رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کی پیشہ ورانہ پسندی مختلف تعلیمی مراحل میں غیر

واضح رہتی ہیں۔ والدین کو ہر حالت میں بچوں سے بات کرنی چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی ان کی پسند اور ناپسند کے اعتبار سے کرنی چاہیے۔ والدین کو مختلف کارکردگیوں سے بچے کو نہیں روکنا چاہیے چونکہ یہی کارکردگیاں طلبا کی پختہ دلچسپی کی عکاسی کرتی ہیں۔

(3) جذباتی واخلاقی نشوونما

اکثر والدین بچوں کی نشوونما میں تعلیمی اور پیشہ ورانہ علاقوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تعلیمی نشوونما سے ایک پیشہ کو حاصل کرنے کی طرف قدم بڑھایا جاسکتا ہے اس پیشہ میں آگے بڑھا جاسکتا ہے ان کی سماجی، جذباتی واخلاقی نشوونما بھی کی جاسکتی ہے مگر پھر بھی والدین کو دیکھنا چاہیے کہ بچے کی اخلاقی وجذباتی نشوونما پوری مقدار میں ہورہی ہے یا نہیں، جس سے بچہ ایک ذمہ دار سماجی شخصیت کا کردار حاصل کررہا ہے یا نہیں؟ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بچوں کو پیار، محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے، انھیں گھر کے مختلف کاموں، تقریبوں میں شامل کروانا چاہیے اور ہم گھر کے کچھ فیصلوں میں بھی انھیں شامل کرسکتے ہیں اگر وہ ان کاموں میں غلطی کریں تو اس کے اوپر نظر رکھنی چاہیے اور بچے کی کارکردگیوں کو دل سے قبول کرنا چاہیے، قبولیت کا رویہ بچوں کی منفرد خصوصیات اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان میں موجود کمیوں کو بھی پہچان لیتا ہے۔ جو بچے والدین کے ساتھ پیار ومحبت کے ماحول میں رہتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو قبول کیا جاتا ہے اور داد وتحسین دی جاتی ہے تو بچے اپنی کمیوں کو تلاش کر ان کو سمجھ کر اس سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی پیشہ کی قبولیت اور مسئلوں کے تعلق سے تبادلہ خیال، پریشانی، تنازعہ کا موضوع، اختلافات وغیرہ پر بالغ بچوں سے بات کرنے سے ان کے رویے میں پختگی آتی ہے مگر والدین کو سب سے پہلے بچوں کے ساتھ صبر وتحمل کے ساتھ تعلق قائم رکھنا والدین کی ذمہ داری ہے یہ ان کی طاقتوں کو بڑھاتا ہے اور جذباتی نشوونما میں بھی مدد کرتا ہے۔ اس طرح کی روایات سے والدین بنا رسمی طور پر اخلاقی تعلیم سے ہی بچے کی جذباتی اور اخلاقی نشوونما کرسکتے ہیں۔

درج بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اگر ہم بچوں کے ساتھ اپنا وقت صرف کرتے ہیں، مثبت ماحول قائم رکھتے ہیں اور قدم در قدم بچوں کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں تو ہم اپنے بچوں کی تعلیمی، پیشہ ورانہ اور اخلاقی نشونما کرسکتے ہیں جو کہ بچے کے حال اور مستقبل کو محفوظ کرے گی چونکہ بچے والدین کی ان تمام باتوں، کوششوں اور کاوشوں کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور جب بھی کوئی مشکل ان کے راستہ میں حائل ہوتی ہے ہماری یہ نشونما، نصیحتیں اور طریقہ کار بچوں کے راستے کو ہموار کرتے ہیں۔ والدین یاد رکھیں کہ جو آپ روزمرہ، صبح وشام اپنی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے محنت اور مشقت کررہے ہیں اس پرسکون ماحول میں بچوں کی کامیاب زندگی کا ایک گوشہ حیات بھی شامل ہے جو آپ کو آخری سانس تک خوشنودی فراہم کرتا رہے گا۔

References:

1. Ansari, T. A. (2016) "Taleem me rahnumayi awr mashawarat", Arshia Publication, New Delhi.
2. Zorufi, M. (2001). Study of the Relationship between Family Structure and Behavior Disorders, M.A. thesis: Islamic Azad University.
3. Agarwal J. C. (1985)"Educational Vocational Guidance and Counselling",Doaba House New Delhi.
4. http://teaching.monster.com/benefits/articles/9762-how-teachers-can-work-with-5-difficult-types-of-parents?page=2
5. Musavi, A. (2004). Functional Family Therapy, Tehran: Al-Zahra University Publications.
6. Ansari, T. A. (2018) "Taleem me rahnumayi awr mashawarat ke nafsiyati pehloo" Noor Publication, New Delhi.
7. Wilder , El. & Watt , TT. (2002). Risky parental behavior and adolescent sexual. Activity at firest coitus. Milbank Quarterly. 80 , 481 – 524.
8. Small , S. A; & Luster , T .(1994). Social information processing factors in reactive and proactive Aggression in children , speer gurops. Journal of personality and Social Psychology.82, 835 – 848.

□□□

Dr. Mohd. Talib Ather Ansari
Assistant Professor
17-4-297/1, IInd Floor,
Naheed Mansion Teachers Colony
Gumpa Road Bidar-585403 Karnataka

نصرت شمسی

اماں بی

اماں کا جنازہ آنگن میں رکھا تھا اور سارے گھر والے اس سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کوئی چارپائی کے پایوں سے لپٹا ہوا تھا تو کوئی ''اماں اماں'' کہہ کر بار بار اماں کی چارپائی پر جھک کر رو رہا تھا۔ کوئی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر رو رہا تھا تو کوئی بیان دے دے کر اماں کے گزر جانے کے غم سے نڈھال تھا مگر جب تک اماں زندہ تھیں، ان کی سانس چل رہی تھی، کسی کے دل میں ان کے لیے اتنی والہانہ محبت نہیں پھوٹی تھی۔ یہ تو ان کی موت کا کرشمہ تھا کہ لگ رہا تھا سب غم سے نڈھال ہیں اور اس گھر میں واقعی کوئی حادثہ ہوا ہے۔

''اماں اماں'' کی صدائیں تھیں اور درمیان میں رکھا جنازہ۔

اماں پچھلے پندرہ دن سے بیمار تھیں۔ سخت سردی کا موسم تھا اور یہ شدید سردی ہمیشہ کی طرح انھیں راس نہیں آئی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں اپنی حکمرانی دکھا رہی تھیں اور سردی شباب پر تھی۔ اماں کو سردی کا اٹیک ہوا تھا۔ وہ پندرہ دن سے اپنے کمرے میں قید تھیں۔ اپنی چارپائی پر اپنے بستر میں، اتنی سردی میں انھیں ٹھنڈا گرم ہو گیا تھا۔ ٹھنڈا گرم کیا ٹھنڈا ہی ٹھنڈا ہو گیا اور وہ بیچاری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ پندرہ دن سے کسی نے ان کے کمرے کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ بے چاری سکڑی سمٹی اپنے بستر میں پڑی کراہتی رہتی تھیں۔ لے دے وقت میں کوئی بہو، بیٹی، پوتی، نواسی یا بیٹا چلا آتا۔ ان کی نظر آنے والی ضرورت پوری کر کے واپس آ کر اس طرح بیان کرتا کہ سننے والا سمجھتا کہ انھیں اپنی بوڑھی ماں کا کتنا خیال ہے۔ گھر والوں کا پڑوسیوں سے کچھ یوں بیان ہوتا:

''کیا کریں ٹائم ہی نہیں ملتا، گھر میں ہر وقت بیمار پڑا ہے۔ اس کی دیکھ بھال سے فرصت ہی نہیں ملتی......بس یہی کام دھندے ہیں۔''

سننے والا سوچتا اماں بی کتنی خوش نصیب عورت ہیں کہ اتنے ڈھیر سارے اپنوں کے بیچ میں ہیں۔ اللہ کرے ہمارا بڑھاپا بھی ایسے ہی گزرے۔

وہ اپنے بارے میں دعا گو ہوتا۔

اماں......نہ جانے کس کس طرح کیسی کیسی ہمتیں جمع کر کے اپنے کمرے سے ملحق باتھ روم تک جاتیں، اللہ ان کی واکر کو سلامت رکھتا اور وہ ہلتی ہلاتی ٹھنڈا پانی استعمال کر کے واپس آ جاتیں۔

گھر والوں کا خیال تھا کہ اماں بی کے کمرے میں گیزر کے پائپ کی کیا ضرورت ہے۔ انھیں کیا کرنا ہے۔ ہفتہ دس دن بعد نہانے کا کام ہوتا ہے، وہ بھی کوئی دوسرا ہی کراتا ہے، سو ایک آدھ بالٹی پانی کسی اور کے باتھ روم سے بھی آ سکتا ہے۔

یوں اماں بی کی ضرورتیں گرم پانی سے بھی محروم ہو گئیں۔ وہ بے چاری چلو بھر پانی بھی چھوتی تو بدن میں سنسنی دوڑنے لگتی۔ ہاتھ سن ہو جاتے، ایسا لگتا بدن سے انگلیاں الگ سی ہو گئی ہوں۔ اماں کمرے میں

صبح کمال حسب عادت کمرے سے باہر نکلے......انگڑائی لیتے آنگن کی طرف آئے۔سردی نے چادر کو مزید لپیٹنے پر اکسایا۔کمال چادر پھیلاتے ہوئے اماں کے کمرے کی طرف آئے اور دروازے کا کواڑ کھول کر اندھیرے میں آنکھیں گڑا کر دیکھنے لگے ,انہیں لگا اماں زمین پر پڑی ہیں۔جلدی سے دونوں کواڑ کھولے ، لائٹ آن کی اور باہر منہ نکال کر سب گھر والوں کو گھبرا کر آوازیں دینے لگے۔

اکیلی سوتی تھیں مگراب جو پندرہ دن سے بیمار ہوئیں تو مسئلہ کھڑا ہوا اماں کی تنہائی کا مگر اس آفر کو گھر کے ہر فرد نے ٹھکرا دیا۔

کسی کو اماں کے کمرے کی دیواروں میں بھوت نظر آتا تو کسی کو ان کی "خرخر" کی آواز پسند نہیں تھی، کوئی کہتا:

"بھیا اماں کے کمرے میں سوجاؤ تو بار بار انھیں چیک کرنا پڑتا ہے اور پھر نیند پوری نہیں ہوتی۔"

کسی کو اپنی جگہ ہی سونے میں چین آتا تھا۔اس لیے اس مسئلہ کو بھی یوں حل کرلیا گیا:

"اماں آپ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل نہ کیا کریں۔رات میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔اس لیے دونوں دروازوں کو برابر سے بھیڑ لیا کریں، اندر سے دبیز پردہ ہے وہ ڈال لیا کریں۔"

اماں بے چاری کیا کہنے کی حالت میں تھیں۔ایسا ہی کرنے لگیں۔

وہ کیا کرنے لگیں۔رات کو ان کے جگر کا ٹکڑا، بڑا بیٹا کمال آتا اور اماں کے ڈھکے ہوئے لحاف کو مزید ٹھیک کرتا، ان کی لائٹ آف کرتا، نائٹ بلب کا بٹن آن کرتا اور......

"اچھا اماں شب بخیر کہتا۔"

کواڑ برابر سے بھیڑ کر پردہ ڈال کر اپنا فرض پورا کر کے چلا جاتا۔

کواڑ کی باریک سی جھری بھی اماں کو رات بھر اے۔سی کا مزہ دیتی اور وہ یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی شال کو مزید درست کر کے منہ ڈھک کر سو جایا کرتیں یا جاگتی رہتیں پتہ نہیں۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا، کمال اپنی ڈیوٹی پوری کر کے چلے گئے تھے۔رات سرد ہواؤں کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی۔سب کمروں کے ہیٹر آن تھے۔کمروں کا موسم انھیں ہلکی سی رضائی اوڑھنے پر مجبور کر رہا تھا، جبکہ اماں کو اپنے کمرے میں دو لحافوں میں بھی سردی لگ رہی تھی۔

صبح کمال حسب عادت کمرے سے باہر نکلے......انگڑائی لیتے آنگن کی طرف آئے۔سردی نے چادر کو مزید لپیٹنے پر اکسایا۔کمال چادر پھیلاتے ہوئے اماں کے کمرے کی طرف آئے اور دروازے کا کواڑ کھول کر اندھیرے میں آنکھیں گڑا کر دیکھنے لگے، انھیں لگا اماں زمین پر پڑی ہیں۔جلدی سے دونوں کواڑ کھولے، لائٹ آن کی اور باہر منھ نکال کر سب گھر والوں کو گھبرا کر آوازیں دینے لگے۔

"فریدہ، طاہرہ، طاہر، زبیدہ ادھر آؤ اماں گر گئیں......"

"اماں گر گئیں؟"

کئی دروازے ایک ساتھ کھلے اور سب بھاگ کر اماں کی طرف آ گئے۔اماں برف کی سل بنی، پتھر کے فرش پر اوندھے منھ گری ہوئی تھیں، واکر ان کے اوپر تھی، کمر ننگی، پیٹ برہنہ زمین سے لگا ہوا اور اماں کا ٹھنڈا جسم......

"اماں!"

کمال نے گھبرا کر آواز دی مگر اماں کی روح کب پرواز کر گئی یہ تو کوئی بتانے والا نہیں تھا، ہاں کیسے پرواز کر گئی اس کے ثبوت موجود تھے۔

"ارے اٹھاؤ......"

"رکو، پہلے چارپائی ٹھیک کرلو، کسی کو اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ گر کر اماں کی موت ہوئی ہے۔"

"ہاں ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔"

کئی ہاتھوں نے مل کر اماں کا شکن زدہ بستر بے شکن کیا، چادر بدلی، تکیہ غلاف بدلا اور پھر اماں کا اکڑا ہوا سرد وجود چارپائی پر لٹا دیا گیا اور اوپر سے لحاف اوڑھا دیا۔

"اماں......!"

سارے کام ہو جانے کے بعد جانے کس سے یہ غم برداشت نہ ہوا اور "اماں" کی صدا اس طرح بلند ہوئی کہ باہر کا دروازہ فوراً بج اٹھا۔

□□□

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur-244901 (UP)

نیکی رنگ لاتی ہے

زینت جبین صدیقی

گاڑی کی چابی میز سے اٹھاتے ہوئے عبداللہ نے ایک نظر پلنگ پر سوتے ہوئے اپنے والد پر ڈالی۔ بیماری نے ان پر اپنا رنگ کچھ زیادہ ہی جما رکھا تھا۔ وہ پہلے والی ڈیل ڈول اب کہاں باقی تھی۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرا کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی انھیں دیکھتا رہا۔ پھر دبے پاؤں باہر کی طرف بڑھ گیا کہ کہیں اس کے قدموں کی آواز سے ان کی نیند نہ کھل جائے۔ پھر سڑک کے کنارے کھڑے اپنے آٹو کو دھکیل کر تھوڑی دور لے گیا۔ پرانا آٹو تھا، اسٹارٹ کرنے پر بہت آواز ہوتی تھی۔ اسے ہمیشہ یہ دھیان رہتا کہ کہیں آٹو اسٹارٹ کرنے کی آواز پر ابو کی نیند نہ کھل جائے۔ آٹو کو گھر سے تھوڑی دور لے جا کر اس نے روکا۔ پھر پرانے کپڑے سے سیٹ پر جمی گرد کو صاف کرنے کے بعد آٹو اسٹارٹ کیا اور وہ چل پڑا۔

یہ تو کھیلنے کودنے کے دن تھے عبداللہ کے مگر حالات کہاں ایک سے رہتے ہیں۔ ابو نے اپنی بیماری کی وجہ سے میڈیکل لے لیا تھا جس کی وجہ سے سروس بڑے بھیا کو مل گئی۔ بیٹے کو نوکری ملتے ہی امی کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ نوکری کے سال بھر بعد، امی بہو کو گھر لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ پھر جو ہوا اس کا کیا کہنا۔ روز کی لڑائی اور جھگڑوں سے تنگ آ کر بھیا بھابھی کو لے کر الگ ہو گئے۔ کمپنی کی سروس تھی۔ کسی چیز کی کمی بھیا اور بھابھی کو تو ہونے سے رہی۔ نئی نئی شادی، کمپنی سے ملا کوارٹر، مہینے کے پچاس ہزار روپیہ۔ ان کی تو جیسے ہر روز عید اور راتیں شب برات ہونے لگیں۔ مصیبت کا پہاڑ تو گھر میں بچے باقی لوگوں پر گر پڑا تھا۔ ابو بیمار تھے، دو کنواری بہن، گھر میں کمانے والا کوئی نہیں تھا، دانے دانے کو محتاج ہو گئے تھے وہ لوگ مگر بھیا نے مڑ کر کوئی خبر نہ لی گھر کی۔ ابو اکثر اپنے نالائق بیٹے کی حرکتوں پر آنسو بہایا کرتے تھے۔ شاید بڑے بھیا کو پتا نہیں تھا کہ وہ آنسو ان کے لیے ایک آزمائش بن جانے والے ہیں جب ہی تو اپنی دنیا میں خوش تھے۔ عبداللہ نے میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹر کالج ایڈمیشن میں لیا تھا کہ تبھی بھیا گھر سے چلے گئے۔ پڑھائی کرنے کا خواب دل میں ارمان بن کر رہ گیا۔ گھر کا سارا بوجھ اس کے کم سن کندھوں پر آ گیا تھا۔ نہ کوئی کام آتا تھا اور نہ اتنا پیسہ اور تجربہ تھا کہ کوئی بزنس کیا جاتا، کسی رحم دل نے عبداللہ کو آٹو چلانا سکھا دیا۔ پھر کیا تھا اس نے اللہ کا نام لیا اور اس کام کو کرنے لگا۔ اپنے والد کی آنکھوں کا تارا اور اماں کے دل کا سکون تھا عبداللہ۔ بڑے بھیا کبھی پلٹ کر نہیں آئے۔ والد کی بیماری کا خرچ، گھر کا خرچ بہنوں کی پڑھائی کا خرچ، اللہ نے اسی آٹو سے پورا کیا۔ صبح منہ اندھیرے عبداللہ آٹو لے کر نکلتا تھا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ آرام کا خیال، بس اپنے کام میں مگن سا رہا کرتا تھا۔ یہ اس کے لیے بہت آزمائش کے دن تھے۔ ہر دن نیا کام نکل آتا تھا، گھر کی ساری رونق جیسے بھیا کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ایک بے رنگ سی اداسی در و دیوار سے لپٹی رہتی تھی اور زندگی اسی میں گزر رہی تھی۔ صبح سے شام اور شام سے رات ہو رہی تھی عبداللہ کے دل میں ایک ہی بات تھی۔ اللہ

نے مجھے ہاتھ پیر اس لیے دیے ہیں کہ میں محنت کر سکوں۔ اللہ نے حرکت میں ہی برکت رکھی ہے۔ محنت کرنے سے کوئی گھستا تھوڑے ہی ہے میرے ہوتے ہوئے میرے گھر والوں کو کسی چیز کی کمی اور پریشانی نہیں ہوگی۔

عبداللہ بہت مگن سا اپنا آٹو لیے جیل روڈ کراس کر رہا تھا۔

ابھی بھی ملگجا سا اندھیرا تھا۔ کسی کی آواز پر اس نے آٹو کو بریک لگایا۔ دیکھا سامنے والی بلڈنگ کے باہر تین لوگ کھڑے تھے۔ اس میں سے کسی نے رکنے کے لیے کہا۔ اسٹیشن جاؤ گے آٹو کے رکتے ہی پوچھا گیا۔

جی ہاں، ضرور جاؤں گا۔ عبداللہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

عبداللہ نے دیکھا۔ نیا شادی شدہ جوڑا تھا اور ان کے ساتھ ان کا سامان۔ سامان کو آٹو کی ڈکی میں ڈال کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ لڑکی ماں کے گلے لگ کر رونے کے بعد آٹو میں بیٹھ گئی۔ عبداللہ نے آٹو اسٹارٹ کیا اور آٹو سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا۔ اپنے کرائے کے پیسے لینے کے بعد وہ پھر سے سڑکوں پر تھا۔ اس کی زندگی بھی دوڑتی بھاگتی گاڑیوں جیسی ہی تھی۔ صبح سے شام تک سڑکوں پر بھاگنا ہی اس کا کام تھا۔

رات کو وہ تھکا ہارا سا گھر آیا تو ابو کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ عبداللہ انھیں لے کر ہاسپٹل آیا۔ جہاں ان کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی کڈنی پوری طرح کام نہیں کر پا رہی ہے اس لیے ان کا Dialysis کروانا پڑے گا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ مگر ہمت سے بڑھ کر مصیبت نہیں ہوتی عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری اور محنت کو مضبوطی سے تھام لیا۔ پیسے نہیں تھے تو کیا ہوا؟ طاقت تھی، گھر والوں کا خیال تھا اور ابو کی تکلیف، ان سب نے مل کر اسے ہمت دی تھی۔ ہفتے میں دو بار Dialysis کرانا تھا۔ یعنی مہینے میں دس ہزار کا خرچہ بڑھ گیا تھا۔ صبح وہ اور جلدی گھر سے نکلنے لگا۔ رات کو اور دیر سے واپس آتا۔ اس نے ایک ایک روپیہ کو جوڑا تھا مگر اب بھی اس کے پاس Dialysis کے علاج کے لیے پورے پیسے نہیں تھے۔ دل میں ایک خلش سی تھی کہ کاش بڑے بھیا اس کی مدد کر دیتے۔ امی چپکے سے ان کے گھر بھی گئیں مگر بھابھی نے دروازہ نہیں کھولا۔ شاید بھیا گھر پر نہیں تھے۔ عبداللہ نے دوبارہ وہاں جانے سے منع کر دیا۔

عبداللہ کو اللہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہی پریشانیاں دیتا ہے اور پھر وہی اس سے نجات بھی دلاتا ہے۔ بس پریشانیوں میں انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے بڑی مشکل سے وہ Dialysis کے لیے پیسوں کا انتظام کر پایا تھا۔

صبح وہ جلدی اٹھ گیا۔ اس نے سوچا گیارہ بجے تک گھر آ جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے ایک بجے ابو کو Dialysis کے لیے بلایا تھا اور کیونکہ آج پہلی بار جانا تھا اس لیے خالد خود جانا چاہتا تھا اپنے والد کے ساتھ۔ آٹو صاف کرتے ہوئے اس کی نظر گاڑی کی ڈکی میں پڑے اس چھوٹے سے بیگ پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ بیگ اٹھا کر وہ گھر کے اندر آیا۔ امی نماز کے لیے اٹھ چکی تھیں جبکہ ابو ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ بیگ اٹھائے ابو کے کمرے میں چلا گیا۔ ٹیبل پر بیگ رکھا اور پھر لائٹ جلائی۔ لائٹ کی روشنی سے ابو کی آنکھ کھل گئی۔ عبداللہ پر ان کی نظر پڑی تو ذرا سا مسکرائے، پھر اٹھتے ہوئے بولے ’جا رہے ہو بیٹا۔ آج مجھے ڈاکٹر کی طرف جانا ہے۔‘

’عبد اللہ نے دیکھا۔ نیا شادی شدہ جوڑا تھا اور ان کے ساتھ ان کا سامان۔ سامان کو آٹو کی ڈکی میں ڈال کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ لڑکی ماں کے گلے لگ کر رونے کے بعد آٹو میں بیٹھ گئی۔ عبد اللہ نے آٹو اسٹارٹ کیا اور آٹو سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا۔ اپنے کرائے کے پیسے لینے کے بعد وہ پھر سے سڑکوں پر تھا۔ اس کی زندگی بھی دوڑتی بھاگتی گاڑیوں جیسی ہی تھی۔ صبح سے شام تک سڑکوں پر بھاگنا ہی اس کا کام تھا‘

ہاں، میں جانے کے لیے ہی نکلا تھا۔ مگر آٹو کی ڈکی میں یہ بیگ پڑا مل گیا تو واپس آ گیا۔ عبداللہ نے بیگ اٹھا کر ان کے پلنگ پر رکھ دیا۔ کیا ہے اس میں انھوں نے حیرانی سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

پتہ نہیں دیکھتا ہوں کھول کر۔ خالد بیگ میں لگے تالے کو ادھر ادھر کرتا ہوا بولا۔ اسے توڑنا پڑے گا۔ میں توڑنے کا جوگاڑ لاتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے عبداللہ صحن کی طرف چلا گیا۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں ایک راڈ تھا جس کی مدد سے وہ تالا توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیگ کے کھلنے پر سب حیران رہ گئے۔ اس میں سونے کے زیور تھے۔ تالا توڑنے کی آواز پر امی اور دونوں بہنیں بھی آ گئی تھیں۔ لاکھ روپے سے کم کے زیور نہیں تھے۔ عبداللہ کے دماغ میں کچھ دن پہلے کا منظر گھوم گیا۔ جب جیل روڈ سے اس نے نئے جوڑے کو اسٹیشن چھوڑا تھا۔ اسے یاد آیا یہ بیگ ان کا ہی تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے بیگ بند کیا۔

کیا ہوا بیٹا۔ افشاں نے حیرانی سے پوچھا۔

ماں مجھے یاد آرہا ہے کہ یہ کس کا بیگ ہے۔ میں ابھی دے آتا ہوں انھیں۔ افشاں کے سوال پر عبداللہ نے پیار سے اسے دیکھا۔

ابو نے پیار سے عبداللہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ امی نے اس کی بلائیں لیں اور دونوں بہنیں خوشی سے اسے دیکھتی رہ گئیں وہ بیگ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

ابو کی Dialysis میں لگنے والے پیسے، گھر کے خرچ میں لگنے والے پیسے، اپنے لیے آٹو، ان زیوروں کو دیکھ کر عبداللہ کو یہ ساری ضرورتیں یاد آنے لگی۔ اس کا آٹو چل رہا تھا۔ آج اسے ابو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا مگر گھر پر راشن کے پیسے نہیں تھے۔ گیارہ بجے تک آٹو چلا کر راشن کے پیسے لانے تھے۔ مگر یہ صبح صبح ایک نیا پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ دل تو موجوں کا سمندر ہوتا ہے۔ عبداللہ کے من میں بھی طرح طرح کے خیالات آرہے تھے، کبھی سوچتا کیا ضروری ہے ان زیوروں کو واپس کرنا، کبھی سوچتا واپس کرآؤں گا تو شاید وہ خوش ہو کر کچھ بخشش ہی دے دیں اور ابو کے علاج میں وہ پیسے کام آجائیں، کبھی وہ سوچ رہا تھا کہ بخشش میں کتنے پیسے ملیں گے۔ اس سے تو بہتر ہے یہ زیور رکھ ہی لینا چاہیے۔ ابو کا کام نکل جائے گا۔ من میں چور آرہا تھا مگر من کا چور دماغ کے سامنے ہار گیا۔ اس کا دماغ اسے غلط کام سے روک رہا تھا۔ اسے گھر سے نکلتے وقت ابو کی دعائیں اور بلائیں لیتی امی یاد آگئیں۔ اسی نے من کے چور کو نکال پھینکا۔

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ بہت سہانی سی صبح تھی۔ عبداللہ نے اپنا آٹو اسی بلڈنگ کے سامنے روکا جہاں سے اس نے نئے جوڑے کو اسٹیشن چھوڑا تھا۔ عبداللہ نے اس مکان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی کافی بڑا مکان تھا۔ مکان کے سامنے چھوٹا سا لان بنا تھا۔ دیواروں پر چھوٹے پھولوں کی ڈالیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ دیوار سے لگا ایک چھوٹا اور خوبصورت سا گیٹ تھا۔ عبداللہ نے دھیرے سے گیٹ کھولا اور بیگ اٹھائے اندر کی طرف چلا آیا۔ پھولوں کا چھوٹا سا لان پار کیا تو سامنے کھلا ہوا Corridor تھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا Corridor سے پہلے لان میں چھوٹی سی میز کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ تب اس نے زور سے آواز لگائی۔

کوئی ہے۔ اندر سے کچھ آواز نہیں آئی۔

اس نے پھر دہرایا۔

کون ہے۔ اس بار اندر سے کسی مرد کی آواز آئی تھی۔

میں آٹو والا ہوں۔ عبداللہ نے بلند آواز میں کہا۔

کیا کہا، آٹو والا۔ اس شخص کی آواز میں بلا کی خوشی تھی، اس کی آواز سڑک تک گئی ہوگی، اس آواز میں جو خوشی کی لہر تھی وہ عبداللہ نے اپنے اندر محسوس کی اس کا دل بھی خوشیوں سے بھر گیا۔

سنتی ہو۔ آٹو والا آگیا۔ آٹو والا آگیا۔ وہ شخص زور زور سے چلا رہا تھا۔ پھر دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک شخص وہیل چیئر پر بیٹھا باہر آیا۔ عبداللہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تب ہی ایک چالیس پینتالیس سال کی خاتون اور ایک لڑکی بھی باہر آگئی، روئی روئی سی لڑکی، پریشان پریشان سی خاتون، لڑکی نے دوڑ کر وہ بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا پھر اسے کھولنے لگی۔

میں نے اس کا تالا توڑا تھا۔ عبداللہ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

وہ لوگ کچھ نہ بولے۔ زیور دیکھتے رہے۔ تمام زیور کو دیکھ کر ماں بیٹی رونے لگیں۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔

بیٹے یہ زیور نہیں ہماری بیٹی کی خوشیاں ہیں۔ عورت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، آنسوؤں سے بھری تھیں ان کی آنکھیں۔

ہمیں تو یقین ہی نہیں تھا کہ یہ زیور واپس ملیں گے۔ مگر اللہ کا کرم

ہے۔ وہ پھر رو پڑیں، بیٹا تم یہ زیور لے کر اندر جاؤ۔ اس شخص نے پیار سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ لڑکی نے شکر بھری نظریں عبداللہ پر ڈالی اور بیگ لے کر اندر چلی گئی۔ یہ لڑکی ہماری بیٹی ہے۔ اس شخص نے بتایا اس کی شادی پچھلے مہینے ہوئی تھی۔ ہفتے بھر پہلے اپنے سسرال جانے کے لیے گھر سے تمھارے آٹو میں اسٹیشن گئی تھی۔

'ڈاکٹر اکرام صاحب ہی ہمارے دوست ہیں جنھوں نے یہ مکان رہنے کے لیے مجھے دیا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں کچھ دے سکوں مگر ہاں تمہاری سفارش تو کر ہی سکتا ہوں
عبد اللہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس کو تو الفاظ بھی نہیں سوجھ رہے تھے شکریہ کے لیے۔ دل میں جو چور تھا وہ تو پہلے ہی کھل گیا تھا اور اب وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا حالات کیسے بھی ہوں، ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے راستے پر ہی چلنا چاہیے۔ جانے کب کہاں اللہ کی رحمت ہو جائے'

ٹرین میں بیٹھ کر جب ہماری بیٹی نے زیور والا بیگ نہیں پایا تو گھبرائی۔ زیور کیا گیا ہمارے گھر میں تو پریشانیاں آ گئیں۔ ہمارے داماد نے دلہن کو بغیر زیور اپنے گھر لے جانے سے منع کر دیا۔ میں ایک پرائیویٹ ریٹائرڈ ٹیچر ہوں۔ پچھلے سال مجھ پر فالج کا اثر ہوا تھا۔ تب سے چل نہیں سکتا۔ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد جو پیسے تھے اس سے بیٹی کی شادی کی تھی۔

مگر قسمت دیکھو سسرال جاتی بیٹی کا زیور کھو گیا۔ یہ مکان میرے ایک دوست کا ہے جس نے ہمیں رہنے کے لیے دے دیا ہے۔ کہتا ہے گھر کی دیکھ بھال ہوتی رہے گی۔ بڑا رحم دل ہے میرا دوست۔ بولتے بولتے ماسٹر صاحب کی آواز بھرا گئی۔"

جی میں آپ لوگوں سے شرمندہ ہوں کہ میں پہلے کیوں نہیں دیکھ پایا اس بیگ کو۔ وہ تو آج صبح آٹو صاف کرتے ہوئے میری نظر پڑ گئی تو واپس کرنے آ گیا۔ بہت ٹھہرا ؤ تھا عبداللہ کے لہجے میں۔

اللہ تمھیں خوش رکھے۔ عورت نے ہاتھ اٹھا کر اسے دعا دی، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئی بولی۔

بیٹا تم تو ابھی تک کھڑے ہو۔ آؤ بیٹھو یہاں اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو خالد لان میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی اندر سے چائے لے آئی۔ خوشی اس کے چہرے پر تھی۔ چائے میز پر رکھنے کے بعد وہ رکی نہیں اندر کی طرف چلی گئی۔

چائے پینے کے بعد وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ ان لوگوں کی ساری پریشانیاں سن کر بخشش کا سارا بخار اتر گیا تھا۔ پھر بھی دل میں خوشی تھی کیونکہ زیور جن کا تھا ان تک پہنچ گیا تھا۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرے والد بیمار ہیں انھیں لے کر Dialysis کے لیے جانا ہے۔ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

Dialysis...... ماسٹر صاحب حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

ہاں...... ابو کو کڈنی پروبلم ہے۔ آج پہلی بار ان کا Dialysis ہے۔ ڈاکٹر نے ہفتے میں ایک بار Dialysis کروانے کو کہا ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ وہ واپسی کے لیے مڑا۔ ماسٹر صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو انھیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ ارے بیٹا، رکو تو۔ اسی عورت نے بڑے پیار سے اسے رکنے کو کہا تو عبداللہ رک گیا۔ کس ڈاکٹر سے کروا رہے ہو ان کا علاج؟ ماسٹر صاحب نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

ڈاکٹر اکرام صاحب سے، عبداللہ نے ادب سے جواب دیا۔

ڈاکٹر اکرام صاحب ہی ہمارے دوست ہیں جنھوں نے یہ مکان رہنے کے لیے مجھے دیا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمھیں کچھ دے سکوں مگر ہاں تمھاری سفارش تو کر ہی سکتا ہوں۔

عبداللہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس کو تو الفاظ بھی نہیں سوجھ رہے تھے شکریہ کے لیے۔ دل میں جو چور تھا وہ تو پہلے ہی کھل گیا تھا اور اب وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا حالات کیسے بھی ہوں، ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے راستے پر ہی چلنا چاہیے۔ جانے کب کہاں اللہ کی رحمت ہو جائے۔

□□□

Zeenat Jabeen Siddiquee
C/o. Nazir Hussain
Old Puralia Road (West)
Road No. 15, H/No. 32
Zakir Nagar, Mango
Jamshedpur-832110 (Jharkhand)

ڈاکٹر عشرت ناہید

ذرا اعتبار پا لے۔۔۔

نہ جانے یہ تشنگی اس کے اندر تلاش کا روپ کب دھار گئی تھی۔ وہ کئی بار سوچتی کہ زندگی کے ہر موڑ پر آخر وہ کیوں اور کیا تلاش کرتی رہتی ہے، ہر راہ گزر پر وہ کسے ڈھونڈتی ہے؟ بس ایک پیاس خود کو مکمل کرنے کی۔ کیسی ادھوری خواہش۔ بھلا کبھی کوئی مکمل بھی ہوا ہے۔ یہ جہان تو ہے ہی ادھورا ادھورا سا۔ یہاں سب کچھ کہاں ملتا ہے اگر یہاں ملتا ہوتا تو پھر عالم محشر کیوں سجتا۔ کیوں روح کو دوبارہ زندہ کیا جاتا تو پھر کیا جنت و دوزخ ہی اس کی ذات کی تکمیل کریں گے؟

اکثر اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوال پیدا ہوتے رہتے جن میں وہ الجھی الجھی کھوئی کھوئی رہتی۔ اس کے اندر کا خالی پن کچھ اور بڑھ جاتا، ذات کے خلا کو پر کرنے کی خواہش پھر سر اٹھانے لگتی۔ وہ خلا وہ کمی جو اس کے اندر اسی وقت سے آ گئی تھی جب ماں کی کوکھ میں اس کا ننھا سا وجود ادھر ادھر ڈولتا رہتا تھا۔ پہلی تلاش تو وہیں سے تھی کہ ماں کب اسے پیار کرے گی، دلار کرے گی۔ وہ اس کے وجود کا حصہ تھی مگر اس کی ماں! غریب ماں اس سے پہلے دنیا میں جنھیں لے آئی تھی ان میں اور زندگی کی الجھنوں میں کچھ ایسی گم تھی کہ یہ بھول ہی جاتی تھی اس کے اندر بھی کوئی ہے۔ کئی بار وہ ماں کو متوجہ کرنے کے لیے پیر پٹختی۔ اس پانی بھرے کنویں میں تیز تیز چکر لگاتی مگر ماں یا تو بے حس تھی یا وہ عادی ہو چکی تھی۔ وہ تھی بھی تو ساتویں اولاد، بھلا اب ماں کو اس سے کیا دلچسپی ہوتی۔ یوں بے اعتنائی میں ہی اسے زندگی کی نعمت عطا ہو گئی تھی لیکن یہ کیا ہوا وہ تو پریوں کے دیس میں اتر آئی تھی اس کے سب بھائی بہن ایک دم گورے چٹے خوبصورت تھے اور قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ پریوں کے دیس میں وہ معمولی نقش و نگار اور گہری سانولی رنگت لے کر آ گئی تھی۔ اس نے ماں کو دیکھا، ماں خود حسن کا مجسمہ اور حسن کی شیدائی بھی۔ دنیا میں آ کر بھی وہ غیر ضروری اضافے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا نام بھی ماورا ہی رکھ دیا گیا تھا، اس کی ماں اب بھی اس کے وجود سے ویسی ہی بے نیاز تھی، وہ تو بھول ہی گئی تھی اسے اور یہ بھی تو ماں کی بے رخی کی جیسے عادی ہو گئی تھی، کبھی ماں کے رویے پر احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی کبھی چیخی چلائی۔

کئی کئی گھنٹے گزرنے کے بعد ماں کا دھیان بھولے بھٹکے اس کی طرف جاتا کہ ارے یہ تو کب سے بھوکی ہے۔ ذرا سی ندامت کا احساس لیے اسے دودھ پلا دیتی۔ یہ ماں کے لمس میں کھو جاتی سکون سے سو جاتی اور ماں پھر مصروف ہو جاتی۔

باپ بے چارہ دن بھر اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنے، ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے صبح سے شام تک کام میں جتا رہتا، وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا شام پانچ بجے تک فیکٹری میں کام کرتا، وہاں سے نکلتا ایک دفتر میں کلرک کی نوکری کرتا وہاں سے آٹھ بجے اٹھتا تو ایک دوسری جگہ کتاب دیکھنے جاتا اور رات گیارہ بجے گھر میں داخل ہوتا۔ صبح وہ بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتا تو رات کو لوٹتا تب تک بچے پھر سو گئے ہوتے۔ بچے سوائے اتوار کے باپ کی شکل بھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔

> انھی کیفیات میں گرفتار کھوئی کھوئی سی وہ کالج پہنچی تھی جہاں اس کی ملاقات سندیپ سے ہوئی۔ سندیپ ایک مہاراشٹرین لڑکا جس کی رنگت بھی گہری سانولی تھی۔ تنہائی پسند تھا اسے لگتا کہ سندیپ کا اور اس کا درد ایک جیسا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے پڑھائی کے ساتھ مختلف موضوعات پر وہ دونوں بے تکان باتیں کرتے اس کی سنگت میں وہ دھیمے دھیمے ہنسنا بھی سیکھ گئی تھی اس وقت اسے لگتا تھا کہ سندیپ ہی اس کی دنیا ہے۔ سندیپ اس کی پہلی محبت، جس کا ساتھ پاکر اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر کی تشنگی ختم ہوتی جارہی ہے وہ بہت مسرور رہنے لگی تھی۔

یوں زندگی کے ماہ و سال گزرتے رہے۔ وہ بے اعتنائی کی شکار بڑی ہوتی گئی ۔خوبصورت تو نہیں تھی، بس ایک خوبی ضرور تھی اس میں، وہ تھی اس کی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر سجی رہتی تھی ۔ قلو پطرہ کی مسکراہٹ۔ کبھی ہنسی یا قہقہہ تو اس کے لبوں سے آزاد ہی نہیں ہوا تھا۔ ہوتا بھی تو کیسے، قہقہے تو علامت ہوتے ہیں زندگی کی خوشیوں کے۔ جب دل کے تاروں کے جلترنگ بجتے ہیں اور روح میں خوشیاں سرایت کر جاتی ہیں تو بے ساختہ ہنسی کے فوارے پھوٹتے ہیں لیکن اس کی ذات تو صرف سنجیدگی میں ڈھل کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں کے درمیان بھی اجنبی سی تھی۔ جبھی تو اس نے کتابوں سے دوستی کرلی، بڑی گہری اور پکی دوستی۔ اب وہ تنہا نہیں تھی اس کے بہت سے ساتھی تھے جو ان کتابوں کے مکین تھے۔ وہ اکثر ان کرداروں سے بے آواز باتیں کرتی، اپنے دل کی اداسی کا ذکر کرتی، آہستہ آہستہ وہ ان کے ساتھ خوش رہنا سیکھ گئی تھی اور یوں وہ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ یہ ان لمحوں میں داخل ہوگئی جب ہولے ہولے کئی خواب آنکھوں میں بسنے لگتے ہیں جب اپنا وجود سب سے پیارا لگنے لگتا ہے۔ جب حساسیت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ جب کبھی بے طرح اداسی چھا جاتی ہے ۔کبھی بے وجہ مسکرانے کو دل چاہتا ہے لیکن اس کے اندر تو جیسے ایک ہی موسم ٹھہر گیا تھا، موسم کیا ایک احساس تھا بس جو اسے ادھورے ہونے کا احساس شدت سے دلاتا تھا۔ تب اس کی نگاہیں پھر پیاسی روح کی طرح بھٹکنے لگتیں اور ایک تلاش محبت کی پھر اس کے اندر مکین بن کر بیٹھ جاتی۔

انھی کیفیات میں گرفتار کھوئی کھوئی سی وہ کالج پہنچی تھی جہاں اس کی ملاقات سندیپ سے ہوئی۔ سندیپ ایک مہاراشٹرین لڑکا جس کی رنگت بھی گہری سانولی تھی۔ تنہائی پسند تھا اسے لگتا کہ سندیپ کا اور اس کا درد ایک جیسا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے پڑھائی کے ساتھ مختلف موضوعات پر وہ دونوں بے تکان باتیں کرتے اس کی سنگت میں وہ دھیمے دھیمے ہنسنا بھی سیکھ گئی تھی اس وقت اسے لگتا تھا کہ سندیپ ہی اس کی دنیا ہے۔ سندیپ اس کی پہلی محبت، جس کا ساتھ پاکر اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر کی تشنگی ختم ہوتی جارہی ہے وہ بہت مسرور رہنے لگی تھی۔

سندیپ جب کبھی کوئی ذو معنی جملہ کہہ دیتا وہ کئی دنوں اس کے سرور میں کھوئی رہتی، جملے کی بازگشت اسے مہکائے رکھتی، دن بہ دن سندیپ اس کے نزدیک آتا جارہا تھا۔

ابھی وہ سرشاری کے عالم میں ہی تھی کہ سندیپ کے گھر سے فون آیا کہ اس کی بہن کی طبیعت بہت خراب ہے انھیں ممبئی لے جایا جارہا ہے سندیپ بھی ممبئی چلا گیا کچھ دن بعد اس کی بہن کے انتقال کی خبر آگئی۔ جس دن سندیپ لوٹ کر آیا یہ اس کے غم کی شدت کو محسوس کرکے اس سے ملنے اس کے کمرے پر چلی گئی۔ سندیپ بہت اداس تھا بہن کی باتیں کرتے کرتے وہ رو پڑا اور روتے روتے اس نے بے اختیار اس کے کندھے پر سر رکھ دیا یہ اس کے لمس کا پہلا احساس تھا وہ اپنے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی کہ سندیپ نے ماورا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اس کے جسم پر رینگنے لگا۔ سندیپ کے لمس نے اس کی حالت غیر کردی تھی۔ اسے اس کا یوں چھو لینا اچھا نہیں لگا۔ وہ اسے زور سے دھکا دے کر وہاں سے دوڑتے ہوئے باہر نکل آئی۔ لمس اور وہ بھی ہوس بھرے لمس نے اس کی پہلی محبت کا بے دردی سے قتل کردیا تھا۔ یہ سانحہ اس کے لیے اذیت ناک تھا۔ اس دن کے بعد اس نے سندیپ کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کئی بار سندیپ نے اس سے معافی مانگی مگر اس کے اندر پاکیزگی کا مجسمہ چور چور ہوچکا تھا۔ یہ جو محبت کو صرف اور صرف

مقدس مانتی تھی، محبت کو ایک ایسے احساس کا روپ دے بیٹھی تھی، جہاں صرف سرشاری ہی سرشاری تھی۔ احساس میں لمس کا تو گزر اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، وہ تو بس محسوس کی جانے والی محبت کی قائل تھی، روح کی سرشاری ہی اس کے نزدیک محبت کی معراج تھی۔ بہت دنوں تک ماورا کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہا۔ وہ بکھرتی رہی جڑتی رہی۔

دن اپنے آپ کو مہینے اور پھر سال کی ردا میں چھپاتے رہے، لیکن ماورا اپنے اندر کی اداسی کو آنکھوں میں بسائے اپنی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ جیتی رہی۔

پھر اس کی زندگی میں فرہاد آیا۔ فرہاد اس کا کلیگ تھا۔ پرکشش، وجیہہ شخصیت کا مالک، ماورا ابھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو پائی کیونکہ وہ خوابوں میں نہیں بلکہ پریکٹیکل زندگی جینے میں یقین رکھتی تھی۔ اپنے گرد اس نے ایک حصار بنالیا تھا۔ کسی سے بات کرتی تو مختصر الفاظ میں، بلاوجہ کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا ایک رعب تھا، ہر کوئی اس کی طرف بڑھنے سے پہلے ہزار بار سوچتا تھا۔ اسے یہ سب بڑا اچھا لگتا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ فرہاد آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا تھا، شاید اس کے کام کرنے کی لگن فرہاد کو اس کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

اس دن اچانک پہلی مرتبہ فرہاد نے اسے فون کر لیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' لہجے میں مٹھاس تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' مختصر جواب تھا،

''آپ مصروف تو نہیں تھیں۔ میں نے بے وقت کال کر لی آپ کو''

''نہیں آپ بات کر سکتے ہیں۔'' ماورا کے لہجے میں متانت تھی۔

''میں آپ کے ساتھ ایک خوشی بانٹنا چاہتا تھا'' وہ حیران ہوئی۔

''دراصل آپ آفس میں اتنا کم بولتی ہیں کہ میں چاہ کر بھی آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا، لیکن آج مجھ سے رہا نہیں گیا اور آپ کو کال کر لی، ماورا آپ نے برا تو نہیں مانا۔''

''نہیں کوئی بات نہیں آپ کہیے کیا بات ہے؟'' لہجے میں شائستگی تھی۔

''دراصل آج ایم ڈی سر نے میرے پروموشن کی خبر دی ہے۔ لیٹر دو ایک دن میں مل جائے گا۔''

''ارے واہ یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے، بہت بہت مبارک ہو۔'' اس نے بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ مبارک باد دی۔

''آپ جانتی ہیں سب سے پہلے یہ خوشی آپ ہی کے ساتھ بانٹ رہا ہوں۔''

''بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔'' اس نے پھر متانت سے ہی جواب دیا۔

''پلیز آپ ایسا نہ کہیے۔ آپ میرے لیے بہت اہم ہیں، میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں''

''بہت شکریہ۔'' یہ پہلی تفصیلی بات تھی جو دونوں کے درمیان ہوئی۔ وہ بہت دیر تک فرہاد کے بارے میں سوچتی رہی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد فرہاد وقفے وقفے سے اسے کال کرنے لگا۔ یوں فرہاد کے ساتھ باتوں کا سلسلہ چل پڑا، آفس میں پہلے سے ہی ان کے بیچ کام کو لے کر اچھی ٹیوننگ تھی اب وہ دوستی میں بدل گئی تھی۔

لیکن اس کے اندر کہیں ایک الجھن ضرور تھی جس کی وجہ اس کا پہلا تجربہ بھی تھا دراصل وہ سندیپ کو بھول نہیں پائی تھی اور مردوں کو لے کر ایک بے اعتباری اس کے اندر گھر کر گئی تھی کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہوس کے پجاری۔ پھر اندر سے کہیں آواز آتی، نہیں نہیں دنیا اتنی خراب نہیں ہو سکتی۔ اپنے آپ کو وہ سمجھاتی رہی، امید کا دامن چھوڑتے چھوڑتے وہ پھر اپنی ذات کو سمیٹ بیٹھتی کہ جنس مخالف کتنی بھی خراب ہو ساری دنیا ایک سی نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں کچھ اچھا بھی ہوگا۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر نرمی آرہی تھی۔

آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے حالات اور مزاج سے واقف ہوتے گئے، خوبصورت جذبے ایک بار پھر نمو پانے لگے تھے، اندر کی بے قراریوں کو سکون کے لمحے میسر آنے لگے تھے۔ پھر دل مسرور رہنے لگا تھا۔ ایک بار پھر آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

اس دن موسم بڑا خوشگوار تھا آفس سے نکلتے ہوئے فرہاد نے اسے چائے آفر کی، جسے اس نے قبول کر لیا، شام خوبصورت ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے، جہاں انھوں نے نسبتاً کونے والی ٹیبل چنی تھی۔ فرہاد بڑے رومینٹک موڈ میں تھا، وہ غزل 'مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے یہ دنیا خوبصورت ہوگئی ہے، گنگنا رہا تھا۔ جس کے جواب میں ماورا کے ہونٹوں پر اس کی الوہی مسکراہٹ ٹھہر سی گئی تھی مانو لبیک کہہ رہی ہو۔ ساتھ میں دونوں باتیں بھی کر رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ رکتا تو مسکراتے ہوئے پھر گنگنانے لگتا۔ اسی دوران چائے آگئی باتیں کرتے کرتے وہ چائے پینے لگے۔ جب اچھے دوستوں کے درمیان باتیں ہوتی ہیں تو موضوع معنی نہیں رکھتا۔ بات شروع آفس کے ماحول سے ہوئی تھی اور اب وہ عورت کے موضوع پر بحث کر رہے تھے فرہاد کا کہنا تھا کہ ''عورت بڑی مشکل شے ہے اسے سمجھنا بڑا ہی دشوار کام ہے''

''عورت سمجھنے کی چیز نہیں، کوئی جیومیٹری، الجبرا کا سوال نہیں، کوئی فلسفے کی کتاب نہیں۔ بس محبت کا پیکر ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے سمجھا نہیں سراہا جائے۔ وہ تو بس ایک خوبصورت احساس ہے اسے بس محسوس کرو۔
''ماورا نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی۔

''میری بات سنو ماورا تم کس دنیا میں رہتی ہو جانتی ہو عورت صرف خوبصورت پیکر ہے۔''

فرہاد نے پیکر پر زور دیتے ہوئے کہا

نہیں جناب غلط فرما رہے ہیں آپ ''عورت پیکر ہے لیکن محبت کا، خوبصورت جذبوں کا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔

نہ جانے تم کس طرح کی فلسفیانہ باتیں کر رہی ہو۔ مرد کی نظر سے دیکھو، اس کے پاس تو صرف ایک نظر ہوتی ہے، عورت کی ایک ہی حقیقت کو وہ جانتا ہے، کہ عورت، صرف اور صرف ایک جسم ہے، خوبصورت پرکشش جسم۔'' یہ کیسا اعتراف کر رہا تھا وہ مردوں کی سوچ کا، فرہاد کی بات نے اسے حیران کر دیا۔

'' غلط کہہ رہے ہو تم۔ تمھاری سوچ بالکل درست نہیں ہے۔ عورت جذبوں کی صداقت ہے، ایک اعتبار ہے۔''

'' نہیں وہ صرف جسم کا اتار چڑھاؤ ہے۔''

''کتنی گھٹیا سوچ ہے تمھاری۔'' ماورا سخت غصے میں آگئی تھی عورت کی اتنی تذلیل اس کی برداشت جیسے جواب دینے لگی تھی۔ پھر بھی اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''فرہاد عورت صرف چاہے جانے کے لیے بنی ہے۔ محبت اور پیار کا دوسرا نام عورت ہے، کیا تم نے کبھی اس کے ایسے روپ کو محسوس نہیں کیا؟۔۔۔''

''تم کیا سمجھتی ہو اگر تمھارا جسم پرکشش نہ ہوتا تو کیا مجھ جیسا خوبصورت مرد تمھارے ساتھ ہوتا۔''

ماورا حیران، ششدر اسے دیکھتی رہ گئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ فرہاد نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے اور اس کے ہونٹوں کی طرف اپنے ہونٹ بڑھا دیئے۔ 'عورت صرف جسم کی کشش ہے' کہتے ہوئے اس نے اسے پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے لب پیوست کرنے کو ہی تھا کہ زناٹے دار تھپڑ نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

''عورت ایک جیتا جاگتا وجود ہے، سمجھے صرف جسم نہیں، ماورا غصے سے کانپ رہی تھی۔

پھر تو فرہاد اپنے آپے سے ہی باہر ہو گیا۔ وہ ایک دم جلال میں آگیا تھا، اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کیا بول رہا تھا، لیکن اس کے ہونٹوں سے برسنے والے انگارے اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کر گئے تھے۔

''ماورا جانتی ہو! تم اوپر سے جتنی کالی ہو اتنا ہی تمھارا دل بھی کالا ہے۔ تم کسی کی محبت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں' وہ اپنا گال بھی سہلا رہا تھا

''تم گھٹیا عورت اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ قلوپطرہ ہو، بالی ووڈ کی ہیروئن ہو لیکن تم نہیں جانتی میں کون ہوں اور میں جواباً تمھارا کیا کر سکتا ہوں۔''

''کیا کر لو گے تم میرا، کر کیا سکتے ہو آواز میں کاٹ تھی۔''

''میں تمھاری پارسائی کے لبادے کو سوشل میڈیا پر کیسے اتارتا ہوں بس اب تم دیکھتی جانا۔''

وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مگر تیز لہجے میں بولی۔

''بس! تم مرد! بس اتنی ہی مردانگی کہ عورت ہاتھ نہ آئے تو اس کی کردار کشی کر دو، اس کے سوا ہے کیا تمھارے پاس، جاؤ جا کر یہ بھی کر لو، بے بس لاچار مرد!''

وہ پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا تھا، اور وہ ایک بار پھر چلچلاتی بے اعتباری کی دھوپ میں کھڑی رہ گئی تھی، پھر ایک بار وہیں لوٹ آئی تھی جہاں صرف اور صرف اس کی رنگت تھی، اس کے معمولی نقش و نگار تھے۔ اس کے اندر اترتا گہرا کالا دھواں تھا کہ سانس لینا بھی مشکل۔۔۔

لیکن اب بھی وہ کبھی کبھی سوچتی ہے کہ محبت کی راہ گزر کتنی خوبصورت ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ کاش یہ ہوس راستے میں نہ آئی ہوتی۔۔۔ یہ کمبخت ہوس اتنی بے تاب کیوں رہتی ہے۔۔۔ ذرا قرار لے لے۔۔۔ ذرا اعتبار پا لے ۔۔۔ محبت تو ہے ہی خود سپردگی کا نام۔۔۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ محبت کو رشتے کا نام دے کر ہوس کو بھی عزت دے دی جائے۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔

□□□

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus
504/122 Taigore Marg
Near Shabab Market
Lucknow-226020 (U.P.)

رخصتی

شمشاد بیگم سنبل

نئی منزل، نیا ہے ہم سفر، لختِ جگر بیٹی
تجھے کرنا ہے آگے زندگی کا یہ سفر بیٹی

شرافت، عاجزی، اخلاق اپنے ساتھ لے جانا
رہے گا سر پہ تیرے سایۂ خیر البشرؐ بیٹی

مرے گھر کی تو زینت تھی مرے آنگن کی رونق تھی
وہی کردار کا جوہر دکھانا اپنے گھر بیٹی

ضروری تو نہیں ہر آرزو پوری ہی ہوجائے
نہ ایسے میں بھی چھوٹے صبر کا دامن مگر بیٹی

زباں شیریں، وفا، اخلاص، صبر و شکر ، خاموشی
انہی تنکوں کو چُن چُن کر سجانا اپنا گھر بیٹی

دعائیں، شفقتیں ماں باپ کی اور بھائی بہنوں کی
خدا حافظ تجھے کہتے ہیں سب با چشمِ تر بیٹی

عمل کرنا تو اس ناچیز سنبلؔ کی نصیحت پر
گزر جائے گی ہنستے کھیلتے شام و سحر بیٹی

☆☆☆

Mrs. Shamshad Begum Sumbul
B-4, Al-yasin Apartment
Old Purulia Road
Zakir Nagar (East), P.O. : Mango
Jamshedpur-831012 (Jharkhand)

فوزیہ رباب

سرخرو ہجر ترا جاں مری لے کر ہوگا
کیا خبر تھی ترا جانا نہیں، محشر ہوگا

مسئلہ میرا سبھی لوگ سمجھتے کب ہیں
تو الجھن کا فقط آپ سے مل کر ہوگا

میں جسے سرسری تکتی تھی یہ کب جانتی تھی
اک وہی شخص مری آنکھوں کو ازبر ہوگا

میں نے اب نیند کو ہی چشم بدر کر ڈالا
خواب آیا بھی جو اس بار تو بے گھر ہوگا

وہ جو کہتا تھا سمندر سی ہیں تیری آنکھیں
دیکھ کر دشت مری آنکھوں میں ششدر ہوگا

تیری خاموش نگاہیں جو بیاں کر دیں گی
دیکھ لینا مجھے ہر لفظ وہ ازبر ہوگا

اب ربابؔ اس کو پرندوں سے بہت نفرت ہے
'وہ جو کہتا تھا کہ آنگن میں صنوبر ہوگا'

Fauziya Rabab
Mohsin Iqbal
Glenmark Pharmaceuticals Ltd,
Plot No. S9, Opposite Sarayu Toyota,
Colvale Industrial Area,
Colvale, Bardez,
Goa-403513

لذیذ پکوان

کاٹھیواڑی چاٹ

اجزا: سفید چنے دو کپ، آلو چار عدد، لہسن دو، ہری چٹنی چوتھائی کپ، کیچپ آدھا کپ، املی کی چٹنی چوتھائی کپ، کارن فلور ایک کھانے کا چمچ، چینی ایک کھانے کا چمچ، پیاز دو عدد، پاپڑی

ترکیب: سفید چنوں کو اُبال لیں۔ آلوؤں کو پیلا رنگ دے کر اُبال لیں۔

پتیلی میں لہسن (پیس کر)، ہری چٹنی، کیچپ، املی کی چٹنی دہی، نمک، کُٹی لال مرچ، چاٹ مصالحہ اور چینی شامل کر کے مکس کریں اور چنے اور آلو بھی شامل کر کے 10 منٹ تک پکالیں۔ اب کارن فلور گھول کر شامل کریں، گاڑھا کر کے اُتار لیں۔ پیاز، پاپڑی، چاٹ مصالحہ ڈال کر پیش کریں۔

نوٹ: اس چاٹ میں گاڑھا گاڑھا ساس ہوتا ہے۔

ربڑی

اجزا: دودھ تین کلو، الائچی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، کیوڑہ دو کھانے کے چمچ، چینی دو کپ، بادام، پستہ حسب ضرورت

ترکیب: ربڑی ایک خاص کڑاہی میں بنائی جاتی ہے جس کا پیندہ سیدھا ہوتا ہے اسی قسم کی کڑاہی میں جلیبیاں بھی بناتے ہیں۔ اسے عام طور پر تئ کہا جاتا ہے۔

ایک کلو دودھ کو تئ میں اس طرح پکائیں کہ دودھ کے بلبلے نہ بنے

بس ہلکا ہلکا پکے، دودھ پکنے سے اوپر جو تہہ آئے اسے فلیٹ چمچ سے کڑاہی میں ایک طرف کرتے جائیں۔

دودھ کے اوپر بننے والی تہہ جب کڑاہی میں ایک طرف کر دیں تو تھوڑا سا مزید دودھ کڑاہی میں ڈالیں۔

جب سارا دودھ کڑاہی میں ڈال دیں اور سائڈ پر کافی گاڑھی تہہ بن جائے تو دودھ میں کیوڑہ، الائچی پاؤڈر اور چینی شامل کرکے دودھ کو پکائیں۔

چینی دودھ میں حل ہو جائے تو دودھ کو جو سائڈ پر بالائی کی تہیں کی تہیں ان کے اوپر ڈالتے ہوئے مکس کریں، یہ سارا آمیزہ گاڑھا ہو کے ربڑی بن جائے گا۔

اس ربڑی کو پلیٹ میں نکالیں اور ٹھنڈا کرکے بادام، پستہ سے گارنش کرکے سرو کریں۔ یہ ربڑی نرم ہوگی۔ اگر خشک ربڑی بنانا چاہتے ہیں تو ربڑی کو مزید پکا کے دودھ اور چینی کو خشک کریں۔ اس ربڑی کے اوپر تھوڑی سی چینی ڈال کے اس کو پلیٹ میں نکال لیں۔ چمچ کو ہلکے ہاتھوں سے مسلسل ہلانا ہے لیکن پیندے کے ساتھ رگڑنا نہیں۔ آخر میں ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

فرائیڈ ماش دال

اجزا: دال ماش ڈیڑھ کپ، لہسن کا پیسٹ 1 چائے کا چمچ، ادرک کا پیسٹ 1 چائے کا چمچ، پسی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، پسی ہلدی آدھا چائے کا چمچ، نمک حسب ضرورت، ٹماٹر 1 عدد، تیل 2 کھانے کے چمچے، پیاز 2 عدد، سوکھی لال مرچ 7-6 عدد، تیز پتہ 2 عدد، زیرہ 1 چائے کا چمچ، گرم مصالحہ 1 چائے کا چمچ، لیموں کا رس 1 چائے کا چمچ، ہرا دھنیا حسب ضرورت، ہری مرچ ڈیڑھ عدد

ترکیب: دال صاف کرکے بھگوئیں اور نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی ڈال کر ابال لیں۔

تیل گرم کرکے اس میں تیز پتہ، پیاز، زیرہ، سوکھی لال مرچ اور لہسن، ادرک ڈال کر فرائی کرلیں۔

اب اس میں دال ڈال کر پکائیں۔ آخر میں ٹماٹر، ہری مرچیں اور گرم مصالحہ پاؤڈر شامل کرکے پکنے دیں۔ لیموں کا رس اور ہرا دھنیا حسبِ ذائقہ چھڑک کر سرو کریں۔

چائنیز رول

اجزا: چکن بون لیس 250 گرام، گاجر ایک عدد، مشروم چار عدد، سرکہ تین کھانے کے چمچے، چلی ساس دو کھانے کے چمچ، کالی مرچ ایک کھانے کا چمچ، ساس دو کھانے کے چمچ، رول پٹی بیس عدد، انڈا ایک عدد، شملہ مرچ ایک عدد، ہری پیاز دو عدد، بند گوبھی آدھ کپ، سویا سوس تین کھانے کے چمچ، چائنیز نمک دو کھانے کے چمچ

مچھلی/سبزی

تل کا تیل ایک کھانے کا چمچ لہسن، ادرک ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: چکن کو اُبال کر ریشہ کرلیں

سبزی باریک پیس لیں اور پتیلی میں تل کا تیل ڈالیں، لہسن ادرک ڈالیں، تمام سبزیاں شامل کریں، چکن، نمک، کالی مرچ، تمام ساس ڈال کر مکس کرکے رول بنالیں۔

انڈا لگا کر بند کریں اور فرائی کرلیں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

□□□

آیوڈن: ضرورت اور افادیت

عظیم اقبال

ان دنوں آیوڈن(Iodin) آمیز نمک کے استعمال کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے اس کی خوب تشہیر ہوتی ہے اور اس کے تئیں لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

آیوڈن ایک کیمیائی مادہ ہے۔ یہ ہیلوجن گروپ میں آتا ہے۔ اس کے متعلق بتایا گیا ہے: "A Lustrous, greyisa-black corrosive, poisonous, halogen element"

اس کے متعلق مزید کہا گیا ہے:

"A non- metalic halogen element obtained usually as heavy shining blackish gray crystals and used especially in medicine, photography and analysis"

اس عنصر کا جوہری نمبر 53 ہے۔ اس کا جوہری وزن 126.9044 ہے۔ اس کے تحلیل ہونے کا عمل 113.5^0C اور ابال کا پوائنٹ 184.35^0C ہے۔

اس کی تلاش سب سے پہلے فرانسیسی کیمیا داں برنارڈ کرہوئی نے 1812 میں کی تھی۔ گرم کرنے پر اس سے نکلنے والی بھاپ کا رنگ بیگنی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر برٹش کیمیا دار ہمفری ڈیوی نے اس کا نام آیوڈن رکھا۔ یہ فرانسیسی زبان کے لفظ 'iode' سے مستعار ہے جو یونانی زبان کے لفظ ioeides سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے، Violet یا بیگنی رنگ۔

تھائرائڈ یا گھینگھا آیوڈن کی کمی سے ہونے والا مرض ہے۔

تھائرائڈ غدود کے متعلق یہ بتایا گیا ہے:

"The largest cartilage of the laryn, having two broad processes that join in front to form the Adam's Apple this is called thyroid"

غدود(Gland) آگے کے حصے میں واقع ہوتا ہے۔ جب جسم کو آیوڈن دستیاب ہوتا ہے تو وہ اس غدود کے وسیلے سے کچھ ہارمونز بنانے کے کام آتا ہے۔ جب جسم میں آیوڈن کی کمی ہو جاتی ہے تو اس غدود کی جسامت بڑھنے لگتی ہے اگر وقت رہتے آیوڈن کی کمی پوری نہ کی جائے تو یہ غدود کافی بڑھ جاتا ہے اور اس میں گانٹھیں(Knots) پڑ جاتی ہیں۔ یہ تھائرائڈ آیوڈن کا استعمال ہارمونز بنانے کے لیے کرتا ہے۔ یہ ہارمونز جسم کی افزائش، دماغ کے فروغ اور جسم کے زیادہ تر افعال بخوبی جاری رکھنے کے کام آتا ہے۔

یہ ہارمونز دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ اس میں خاص ہے، تھائروکسن(Thy-Rox-In) اس میں آیوڈن کے 4 جوہر ہوتے ہیں اور اسے مختصر میں T-4 کہتے ہیں۔ دوسرا ہارمون ہے ٹرائی۔ آیوڈوتھروپن (Iodo-Thy-Ro Thro Phin) اسے مختصر میں T-3 کہتے ہیں۔

میانے لوگوں میں آیوڈن کی کمی سے گھینگھا ہو سکتا ہے۔ ان کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ کاہلی چھائی رہتی ہے۔ جلد کے خشک ہونے کی شکایت ہوتی ہے۔ جسم پر سوجن بھی ہو سکتی ہے۔ اس مرض کو تھائرائڈ کہتے ہیں۔

آیوڈن کو جسم میں کئی طریقوں سے پہنچایا جاتا ہے۔ یہ مچھلیوں کے تیل میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آٹا میں ملا کر، دودھ، چینی وغیرہ کے ساتھ آیوڈن لیا جاسکتا ہے۔ تاہم سب سے آسان طریقہ ہے۔ نمک میں ملانا۔ اس طریقے سے غریب، امیر، چھوٹے، بڑے سارے لوگ آیوڈن لے سکتے ہیں۔

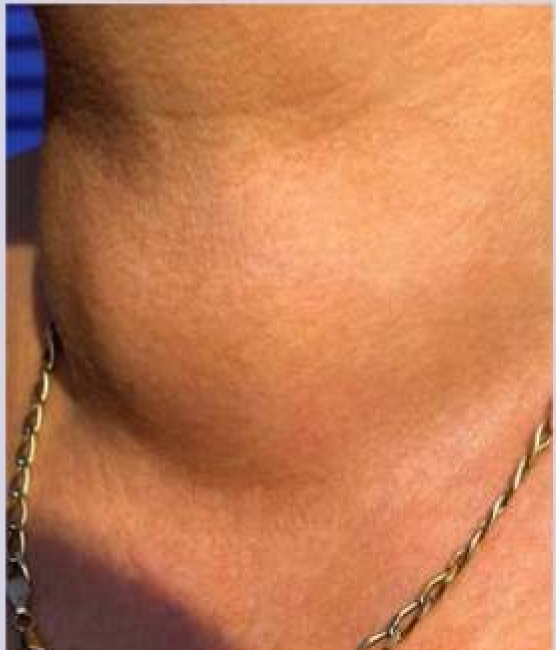

کئی تحقیقات کے بعد آیوڈن لینے کا عمدہ ترین طریقہ نمک مانا گیا ہے۔ اس لیے آیوڈن آمیز نمک کھانے پر زور دیا جاتا ہے۔

نمک میں آیوڈن ملا کر دینا سہل اور مفید ہوتا ہے۔ نمک کا استعمال غذائی اشیا بنانے کے علاوہ برف و آئس کریم جمانے لسکٹ بنانے، صابن بنانے اور چمڑا تیار کرنے میں ہوتا ہے۔

نمک کو آیوڈن آمیز بنانا آسان ہے۔ چونکہ نمک چنے گنے مقامات پر ہی بنتا ہے اس لیے اس کو آئیوڈن آمیز کرنے میں سب کچھ اختیار میں رہتا ہے۔

آیوڈن کو دوسری اشیا میں ملانے کی بہ نسبت نمک میں اس کی آمیزش کرنا ارزاں اور سہل ہے۔ آیوڈن کی آمیزش سے نمک کے ذائقے، بو، شکل اور صفت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ نمک کافی سستا بھی ملتا ہے۔ ہر فرد روزانہ مفید مقدار میں سالہا سال اسے استعمال کرسکتا ہے۔

آیوڈن نمک سے آیوڈن ضائع نہ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے نمک کو پلاسٹک کی بوریوں میں رکھا جائے۔

مزید آیوڈن نمک کے لیے پلاسٹک کے شکستہ بوروں کا استعمال نہ کرنے کی تاکید ہے۔ اسے کھلے بوروں میں نہ رکھیں۔ ایسے نمک کو دھوپ، نمی اور بارش سے محفوظ رکھنے کی صلاح ہے۔

ثابت کرنے کی کہانی تو آپ نے ضرور سنی ہوگی کہ کیسے کسی مملکت میں ایک شہزادی نے بادشاہ کے تئیں اپنی چاہت کا موازنہ نمک سے کرکے انھیں ناراض کردیا تھا، لیکن نمک کے بغیر کھانا کھانے پر نمک کی حقیقت واضح ہوگئی تھی اور پھر بادشاہ کی ناراضگی ختم ہوئی تھی۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ نمک دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے اور اس کی حقیقت اسی وقت سامنے آتی ہے جب ہمیں عمدہ سے عمدہ کھانا پھیکا کھانے کو ملے۔

بہر حال، نمک کو اعتدال سے استعمال کریں۔ اس کے زیادہ استعمال سے بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے، زیادہ نمک لینے سے پرہیز لازمی ہے۔ کبھی کبھی تو نمک سرے سے چھوڑ دینے کی ہدایت بھی دی جاتی ہے۔ اس ہدایت کے پیروی لازمی ہے تاکہ صحت برقرار رہے۔

□□□

Azim Iqbal
Adabistan
Ganj No.1
Bettiah-845438 (Bihar)

حسن کی نگہداشت

ایلو ویرا جیل میں انڈا شامل کر کے استعمال کریں، ایسا زبردست ٹوٹکہ کہ یقین جانیں جان کر دنگ رہ جائیں گی

ایسی خواتین جو چاہتی ہیں کے انکے بال سلکی اور چمکدار ہوجائیں اور لگیں وہ ہر دعوت میں بالوں کی وجہ سے حسین تو یہ خاص گھریلو ٹوٹکہ استعمال کریں اور سلکی بالوں سے سب کو حیران کریں۔

اجزا: ایوا کاڈو ایک عدد (پیسٹ بنالیں)، انڈا ایک عدد، ایلو ویرا جیل دو کھانے کے چمچ، زیتون کا تیل ایک کھانے کا چمچ

طریقہ: اچھی طرح مکس کریں۔ بالوں پر لگا کر بیس منٹ کے لئے چھوڑ دیں۔ اب بالوں کو دھولیں۔

کیا آپ پسی دار چینی کے استعمال کا یہ فائدہ جانتے ہیں؟ ہزاروں روپے کی ٹپ جانیں بالکل مفت

ایسی خواتین جو روز باہر دھوپ میں جاتی ہیں ان کے ہاتھ اور پیر دھول اور مٹی کی وجہ سے خراب ہوجاتے ہیں لیکن بتایا گیا طریقہ یقیناً آپ کے اس مسئلے کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔

آدھا کپ پسی دار چینی میں آدھا چائے کا چمچ لیموں کا رس دو کھانے کے چمچ ناریل کا تیل ملا کر بوتل میں رکھ لیں۔

رات کو روزانہ ہاتھوں اور پیروں پر مساج کریں پھر ان کو دھو کر سو جائیں۔

ایسا کرنے سے آپ کے ہاتھ پیر روز چمکیں گے اور ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی جو آپ کی اچھی جلد کے لیے ضروری ہے۔

کیا آپ کے خوبصورت چہرے پر بھی مہانسے ہوجاتے ہیں؟ تو کریں ابھی اس کا خاتمہ صرف اس ٹپ سے اور رکھیں اپنے چہرے کی خوبصورتی کو برقرار

ایک کپ ایلو ویرا کے گودے کو بلینڈ کرلیں۔ پھر اس میں ایک عدد لیموں نچوڑ کر اچھی طرح مکس کریں۔ پانچ عدد لونگ کو پیس کر پاؤڈر بنالیں۔ ایک چینی کا پیالہ لیں (یہاں چینی سے مراد چینی سے بنے برتن ہیں) اب ایک چٹکی لونگ اس میں شامل کریں۔

ایلو ویرا اور لیموں کا مکسچر آدھا چائے کا چمچ اس میں شامل کریں اور

اچھی طرح مکس کریں۔

ایکنی، پمپل، بلیک وائٹ ہیڈز پر لگائیں اور پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

دو سے تین دنوں میں بہتر نتائج حاصل کریں۔

کیا آپ کے ہونٹ لپ اسٹک لگانے کے بعد خشک ہونے کی وجہ سے پھٹ جاتے ہیں؟ تو صرف یہ ایک چیز لگانے سے ہونٹ نرم و ملائم ہو جائیں گے اور پھٹیں گے نہیں

خواتین کو اکثر میک اپ کرنے کے دوران یہ مسئلہ رہتا ہے کہ لپسٹک لگانے کے بعد ہونٹ خشک ہونے کی وجہ سے پھٹ جاتے ہیں جو نہایت برے لگتے ہیں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ہم آپ کو اس مسئلے کا حل بتانے جا رہے ہیں جو اس مقصد کے لیے نہایت فائدہ مند اور آزمودہ ہے۔ لپ اسٹک لگانے سے قبل 5 منٹ کے لیے ٹوتھ پیسٹ کو ہونٹوں پر لگالیں۔

پھر ٹشو کی مدد سے اسے صاف کریں۔

اب لپ اسٹک لگالیں اس سے ہونٹ خشک نہیں ہوں گے اور نہ ہی پھٹیں گے ساتھ ہی یہ نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

کیا آپ گرتے بالوں سے پریشان ہیں تو کریں ان کی حفاظت اور بنائیں ان کو مضبوط صرف اس طریقے سے

بہت سی خواتین بالوں کے بہت سے مسائل میں مبتلا ہوتی ہیں جس میں سے ایک بالوں کا گرنا بھی عام ہے۔ اگر آپ کے بال بھی بہت گرتے ہیں تو یہ ٹوٹکہ آزمائیں اور کریں اپنے بالوں کی حفاظت گھر بیٹھے۔

پچاس گرام خشک آملہ کو 100 گرام لیموں کے رس میں پیس کر رکھیں۔ روزانہ رات کو سر پر لگا کر سو جائیں۔ پھر صبح کسی ہربل شیمپو سے دھولیں۔

جب گھر میں ہی ہو ہاتھوں اور پیروں کی رنگت صاف تو پارلر کیوں جانا، صرف لیموں میں یہ ملا کر لگانے سے ایسا فرق آئے گا کہ آپ یقین نہیں کریں گے

اکثر خواتین دن بھر کی مصروفیت کے باعث وقت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہاتھوں پیروں کا خیال نہیں رکھ پاتی ہیں۔ لیکن آج ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ بغیر پارلر گئے گھر بیٹھے کیسے آپ کم وقت میں اپنے ہاتھوں اور پیروں کی خراب رنگت واپس لا سکتے ہیں؟

اس کے لیے ایک لیموں کے چھلکے پر چینی لگا کر ہاتھ اور پاؤں پر رگڑیں۔ اس عمل کو روزانہ کرنے سے جلدی فرق محسوس ہونے لگے گا۔ اس عمل کے لیے دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ کھیرے کے چھلکوں کو رگڑیں اور ایلو ویرا کا استعمال بھی فائدہ مند ہے۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' ستمبر 2019 پیش نظر ہے جس میں کوئی درجن بھر ابواب شامل ہیں۔ اداریہ کے مطابق قومی اُردو کونسل نے عصرِ حاضر میں اُردو کے فروغ کے لیے عصری تقاضوں کے مطابق انوکھے طریقے اپنائے ہیں جیسے اُردو کونسل نے ملک کے دور افتادہ علاقوں کے غیر اُردوداں طلبہ تک کو اُردو تحریر و تقریر از بر کرا دینا اور باقی ماندہ دھندلے گوشوں تک موبائل وین کے ذریعہ اردو تنویر کی رمق پہنچا دینا علاوہ ازیں اردو ایپ اور موبائل کی سہولتیں سونے پر سہاگہ ہیں۔ کتابوں کی طباعت میں نسوانی ادب و طبی مسائل سے متعلق موضوعات ہمیشہ پیش نظر رہے ہیں۔ اس طور ''خواتین دنیا'' کونسل کے دیگر اہم جرائد کے قدم بہ قدم اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔

بشمول اس احوال کے اس شمارے میں باقی ماندہ نو(9) موضوعات بھی شامل ہیں اور یوں آپ کی اس کاوش کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے۔ متین عمادی

مہکتے پھول کو خوشبو کا لبادہ کون دیتا ہے
فلک کی مانگ کو زرّین بُرادہ کون دیتا ہے

چلیے ''شخصیت'' کے ذیل میں شفیقہ فرحت (ص 5) کو پہلی مزاح نگار خاتون قرار دیا گیا ہے۔ اس قرارداد سے قبل مزید کچھ تحقیق کی زحمت گوارہ کر لی جاتی تو بہتر تھا۔ ''نکہت سخن'' (ص10) میں کوئی آٹھ شاعرات کے منتخب اشعار دیئے گئے ہیں۔ ان میں یہ شعر کہ ''نشانِ منزل سے خبر ہیں..... '' پر مزید گہری فکر کی جاتی تو شعر مؤثر ہو جاتا۔

''جہانِ نسواں'' (ص 11 تا ص 31) میں پانچ مقالے درج ہیں۔ سبھی قابل توصیف ہیں پر ''اُردو شاعری اور تصورِ زن'' (ص21) میں از اول تا آخر منطقی تسلسل برقرار ہے اور ص 25 پر یہ جملہ کہ ''...... کائنات ارضی ایک البم ہے اور عورت اس البم کی سب سے حسین تصویر ہے..... '' بڑا ہی نادر خیال ہے۔ ''قانون میں خواتین'' کے تحت ''خواتین ریزرویشن بل..... '' (ص32) پر بحث کی گئی ہے۔ اب قانون کے خلاف کوئی کیا زباں کھولے۔ ''کہانیاں' (ص35 تا ص 48) کے ذیل میں چار اچھی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ ان میں کہانی ''دوسرا سائبان'' (ص35) قرین قیاس اور پیش کش نہایت دلکش اور قابل تعریف ہے۔ ''حسن سخن'' میں چار آزاد نظمیں (ص49 اور 50) اچھی ہیں۔ آپ خالی الذہن اور فرصت میں بیٹھے ہوں تو لطف بھی لیجیے اور گورستان کا سکون بھی۔ ص 51 پر ہندی آمیز اچھا گیت درج ہے۔ گویا

انتظار میں بیٹھے بیٹھے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد پہلے تو آپ اپنے ہضمی نظام (ص 54) کو درست کیجیے اور پھر ص (52) پر لذیذ پکوان کا ذائقہ چکھیے۔ حسن کی نگہداشت کے نایاب جتن ص 58 اور 59 پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ خواتین خبرنامہ (ص 61) آپ کی معلومات اور تحیّر میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ اس شمارہ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی محسوس ہوا کہ فیضؔ۔

مرے دامن میں آگرے ستارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-١١، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

الحمدللہ ماہنامہ ''خواتین دنیا'' ستمبر 2019 کا شمارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ کور پیج پر معصوم ہندوستانی عورت کا عکس اس کی شخصیت کے اوصاف کو بیان کرتا ہے۔ اس کے اندر محبت، شفقت، خلوص، ایثار اور ممتا کی مورت بسی ہے۔ گذشتہ اداریہ کی طرح اس ماہ کا اداریہ بھی کافی کارآمد اور معلومات افروز ہے۔ مدیرِ اعلیٰ نے اردو زبان کے فروغ میں قومی کونسل کی سرگرمیوں کا خوبصورت خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کونسل کی جانب سے تیار کردہ موبائل ایپ قابل ستائش ہے۔ اس کے ذریعہ قاری اپنے موبائل فون میں اپنی پسند کی کتابیں ڈاؤن لوڈ کر کے اس سے کہیں بھی استفادہ کرسکتا ہے۔

شمارے کا پہلا مضمون ''شفیقہ فرحت: پہلی مزاح نگار خاتون'' (ظفرالاسلام) کافی دل چسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر میں اردو کی پہلی مزاح نگار خاتون 'شفیقہ فرحت' کی شخصیت اور ان کی تصانیف سے واقف ہوئی جن سے میں اب تک ناآشنا تھی۔ یہ مضمون کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف نے شفیقہ فرحت کی شخصیت کا اجمالی تعارف پیش کرنے کے ساتھ ان کی پیدائش، تعلیم، ملازمت، ادبی کارناموں، مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں اور ان کے ایوارڈ کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ مضمون نگار نے شفیقہ فرحت کو نئے سرے سے دریافت کر کے ادبی حلقوں میں پیش کیا ہے۔ مضمون کو پڑھ کر ان رسالوں کا بھی علم ہوتا ہے جن سے شفیقہ فرحت وابستہ تھیں، مثلاً ''چاند، نقش کوکن اور کرنیں'' وغیرہ۔ یقیناً یہ مضمون شفیقہ فرحت پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نئے در کھولے گا، اور ان کے لیے کافی کارآمد ہوگا۔

ستمبر کے شمارے میں ادبی مضامین، کہانیاں، شاعری، خواتین کی خبریں، لذیذ پکوان وغیرہ شامل ہیں۔ رسالے کی اہم خوبی اس کی آرائش و زیبائش ہے، مضامین سے جڑے مصنفین اور ان کی تصانیف کی تصویریں خوبصورتی سے پیش کی گئی ہیں۔ یہ تصویریں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ میری نیک خواہشات ماہنامہ 'خواتین دنیا' اور اس کے تخلیق کاروں سے وابستہ ہیں۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ اس رسالے کو اردو ادب کے قیمتی سرمایہ کی حیثیت حاصل ہو۔

ثنا غزل، ریسرچ اسکالر بنارس ہندو یونیورسٹی، بجڑیہہ، وارانسی، اترپردیش

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' کا ستمبر 2019 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ اس خوب صورت رسالے کی خاص اور دلچسپ بات یہ لگی کہ اس میں خواتین قلم کاروں کی تحریروں اور ان کی علمی کاوشوں سے متعلق معلومات آسانی سے مہیا ہو جاتی ہے۔ یہ رسالہ عورتوں کے احساسات اور مسائل کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ ''مشعل'' کے عنوان سے لکھا گیا اداریہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں اردو کے فروغ میں قومی کونسل کی خدمات کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

شمارے کے تمام مشمولات اہم اور دلچسپ ہیں لیکن ظفرالاسلام کا مضمون ''شفیقہ فرحت پہلی مزاح نگار خاتون'' بے حد پسند آیا۔ یہ مضمون اس لیے اہم اور دلچسپ ہے کہ ظفرالاسلام نے ایک ایسی خاتون پر قلم اٹھایا ہے جس پر ہمارے ناقدین کی توجہ کم گئی ہے اور ہم جیسے ناقص طلبا ان کی خدمات سے بہت کم واقف ہیں۔ انھوں نے شفیقہ فرحت کی حالات زندگی، تعلیمات، مشاغل اور تصنیفات و تالیفات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ شفیقہ فرحت ہندوستان کی پہلی مزاح نگا ر خاتون تھیں۔ دراصل ہمیں طنز و مزاح کے حوالے سے چند اہم نام بتا دیے جاتے ہیں لیکن شفیقہ فرحت جیسا اہم نام ہمارے ذہنوں میں نہیں آپاتا ہے۔ ظفرالاسلام نے شفیقہ فرحت پر مضمون لکھ کر اس طرف توجہ دلائی، اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دوسرا دلچسپ مضمون جنیفر رضوی کا ''دبستان مرشدآباد کی شاعری میں عورتوں کا اہم کردار'' لگا جس میں بنگال کی چار اہم شاعرات شرف النساء اشرف، صغرا سبزواری، سیدہ نسیم بیگم اور ریحانہ نواب کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں بے حد اہم اور دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ خواتین سے متعلق مضمون شائع کیے گئے ہیں۔ خواتین سے متعلق آرائش و زیبائش، باورچی خانہ، حسن کی نگہداشت کے علاوہ خواتین خبرنامہ بھی توجہ طلب ہے۔ 'خواتین دنیا' میں خواتین سے متعلق اہم معلومات موجود ہے جو خواتین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

محمد عامل خاں، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

□□□

مالیگاؤں شہر کی ہونہار طالبہ سمیہ انصاری کو فزکس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

مالیگاؤں: اردو سٹی (ایس این انصاری) جب ایک لڑکی تعلیم حاصل کرتی ہے تو پورے سماج و معاشرے کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مالیگاؤں شہر کی ایک ہونہار طالبہ سمیہ انصاری صاحبہ نے۔ موصوفہ نے فزکس جیسے مشکل مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے نا صرف خاندان بلکہ شہر کا نام بھی روشن کیا ہے۔ امسال انھیں پونے یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کی جانب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

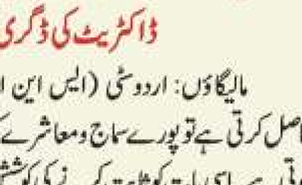

موصوفہ کا [illegible] اسلامپورہ کے ایک تعلیمی گھرانے سے ہے ان کے والد معین الدین انصاری (سول انجینئر)، والدہ عابدہ محی الدین (گھریلو خاتون)، دادا عبدالواحد سیٹھ (مجاہد آزادی) اور نانا ڈاکٹر خلیل احمد قاری محمد حسن (ایم بی بی ایس) ہیں۔ آپ ابتدائی تعلیم اسلامپورہ کی سوئس ماڈل پرائمری، ثانوی تعلیم دی مالیگاؤں گرلس اور دی مالیگاؤں جونیئر کالج سے مکمل کرنے کے بعد جے اے ٹی سنیئر کالج سے فزکس مضمون میں گریجویشن سال 2010 میں حاصل کرتے ہوئے پونے یونیورسٹی سطح پر چوتھا مقام حاصل کیا۔

دوران تعلیم جہاں آپ نے تعلیم پر توجہ دی وہیں آپ نے کھیل کود اور فنون پر بھی اپنی توجہ کو مرکوز رکھتے ہوئے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ایک اچھی ڈرامہ آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ ایک اچھی والی بال کھلاڑی اور ڈرائنگ میں اپنی بہترین مہارت کا مظاہرہ بھی پیش کرتی رہیں۔

سمیہ انصاری نے دوران ڈاکٹریٹ اپنی تحقیقی خدمات شعبہ فزکس پونے یونیورسٹی کے علاوہ سالیڈ اسٹیٹ فزکس ڈویزن، بھابھا اٹومک ریسرچ سینٹر میں بطور ریسرچ اسسٹنٹ کام کو انجام دیا۔ آپ نے اپنا تحقیقی مقالہ بھابھا اٹومک ریسرچ سینٹر کے سائنس داں ڈاکٹر دیباشیش سین اور پونے یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی گائیڈ ڈاکٹر وائی ڈی کولیکر کی رہنمائی میں مکمل کیا۔

دوران تعلیم موصوفہ کو جے آر ایف اور ایس آر ایف جیسے تحقیقی وظائف سے بھی استفادہ ہوا۔ آپ نے مقالے کی تیاری کے لیے کانفرنس، سیمینار اور ورکشاپ میں شرکت کی اور اپنی قابلیت کی بنا پر بہت سارے انعامات کی حقدار بھی رہیں۔ موصوفہ کی خواہش ہے کہ ریسرچ کے میدان میں مزید تعلیم حاصل کرتے ہوئے اپنے پیچھے آنے والی شہر کی طالبات کے لیے ایک مشعل راہ ثابت ہوں۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

جوامع الحکایات ولوامع الروایات (جلد اوّل)

مؤلف: سدید الدین محمد عوفی

مترجم: غلام سرور

صفحات: 275

قیمت: 155 روپے

ارباب نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

مرزا سلامت علی دبیر (مونوگراف)

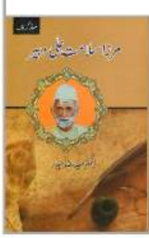

مصنف: سید رضا حیدر

صفحات: 134

قیمت: 85 روپے

خود نوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرقی

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2019, Vol.0 3, Issue: 11 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025